مقدمہ تفسیر نظام القرآن

تالیف مولانا حمید الدین فراہیؒ - ترجمہ مولانا امین احسن صاحب اصلاحی

[استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر نظام القرآن وتاویل الفرقان بالفرقان پر جو مقدمہ لکھا ہے اُس میں تفسیر کے متعلق نہایت اصولی مباحث بیان ہو گئے ہیں۔ اس کا ترجمہ عام اہل علم کے فائدہ کے لیے شائع کیا جاتا ہے۔ جو بحثیں رسالہ کے عام قارئین کے لیے کچھ زیادہ مفید نہیں ہو سکتیں وہ ہم نے حذف کر دی ہیں۔ جب یہ ترجمہ مستقل کتاب شائع ہوگا، اس میں شامل کر دی جائینگی۔ بعض بحثیں ناتمام رہ گئی ہیں لیکن فوائد سے خالی نہیں۔ اس کو غور سے پڑھنے کی ضرورت ہے۔ سرسری نظر سے مطالب گرفت میں نہیں آئینگے۔ مترجم]

اللہ تعالیٰ کی توفیق وعنایت سے اس کتاب میں میں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ آیات قرآن کے باہمی تعلق کو واضح کروں اور قرآن مجید کی ایسی سادہ تفسیر لکھوں جو ان تمام اختلافات سے بالکل پاک ہو جو ہمارے اندر عہد نبوت کے بعد پیدا ہوئے۔ میں نے آیات کے معانی انکی مماثل دوسری آیات کی روشنی میں متعین کیے ہیں اور ہر سورت کے نظام کو اسکے عمق میں اُتر کر اور اس کے سیاق کو سمجھ کر معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس جدوجہد سے جو کچھ سمجھ میں آیا ہے اس کو عقل ونقل سے پوری طرح مدلل کیا ہے۔ اور اس راہ میں صرف اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی بصیرت میری رہنما رہی ہے۔ میں نے کسی شخص کی پیروی نہیں کی ہے۔ تاہم یہ سمجھنا صحیح نہیں ہوگا کہ نظم کی تلاش میں، میں منفرد ہوں۔ اس سے پہلے بھی علماء کی ایک جماعت نے اس راہ میں کوشش کی ہے اور اس پر کتابیں لکھی ہیں۔ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ نے اتقان میں لکھا ہے:-

ابو حیان کے شیخ علامہ ابو جعفر بن زبیر[1] نے خاص اس عنوان پر ایک کتاب تالیف کی ہے۔ اس کا نام

[1] بانکی پور پٹنہ کی اورینٹل لائبریری میں اس کتاب کا ایک نسخہ (۹) موجود ہے۔ میرے پاس اسکی نقل موجود ہے۔ مصنف کا نام ابو جعفر [illegible]

البرہان فی مناسبۃ سور القرآن ہے۔ اہل عصر میں سے شیخ برہان الدین بقاعی نے بھی اپنی کتاب نظم الدرر فی تناسب الآی والسور میں نظم کو خاص طور پر پیش نظر رکھا ہے"۔

اس کے بعد علامہ سیوطیؒ نے اپنی کتاب کا بھی ذکر کیا ہے جس میں سورتوں اور آیتوں کی مناسبت کے علاوہ اعجاز قرآن کے وجوہ بھی بیان کیے ہیں۔ نیز فرماتے ہیں کہ "نظم کا علم ایک نہایت اعلیٰ علم ہے۔ اس کے اشکال کی وجہ سے علماء نے اس سے بہت کم تعرض کیا ہے۔ امام فخر الدین رازی تنہا شخص ہیں جنھوں نے اس کی طرف سب سے زیادہ توجہ کی اور انھوں نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ قرآنی لطائف کا بڑا حصہ ترتیب و ربط کے اندر چھپا ہوا ہے"۔

مجھے خود امام رازیؒ کی تفسیر میں، آیت ولو جعلناہ قرآنا اعجمیا الآیہ (حم السجدہ) کے تحت ان کی یہ تقریر ملی:-

"اس آیت کی شان نزول کے باب میں مروی ہے کہ کفار نے ازراہ شرارت کہا کہ قرآن مجید کسی عجمی زبان میں کیوں نہیں نازل کیا گیا تو یہ آیت اتری۔ میرے نزدیک اس طرح کی باتوں سے قرآن مجید پر سخت اعتراض لازم آتا ہے۔ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ قرآن میں ایسی آیتیں ہیں جن میں باہم گرکوئی تعلق نہیں ہے۔ اور یہ چیز قرآن مجید پر ایک بہت بڑے اعتراض کا دروازہ کھولتی ہے۔ اس اعتراض کے ہوتے ہوئے قرآن کو ایک معجز کتاب ثابت کرنا تو الگ رہا ہم اس کے ایک منظم کتاب ہونے کا بھی دعویٰ نہیں کر سکتے۔ میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ یہ سورہ شروع سے لیکر آخر تک بالکل مسلسل کلام ہے (اس کے بعد سورہ کے مضمون پر اجمالاً گفتگو کر کے فرماتے ہیں) ہر شخص جس میں انصاف ہو گا وہ دیکھ سکتا ہے کہ اگر آیت کی وہ تفسیر کی جائے جو ہم نے کی ہے تو یہ سورہ شروع سے لے کر آخر تک ایک منظم کلام کی صورت میں ڈھل جاتی ہے جو ایک خاص موضوع کو پیش نظر رکھتا ہو۔ اور یقیناً یہ تفسیر اس تفسیر سے کہیں بہتر ہو گی جو لوگ بیان کرتے ہیں"۔

اس کے برعکس ایک دوسری جماعت ہے جس کا خیال ہے کہ قرآن مجید میں کوئی نظم نہیں ہے شیخ عزالدین بن عبدالسلام کہتے ہیں :-

"قرآن مجید، بیس سال سے کچھ زیادہ کی طویل مدت میں، مختلف حالات کے لیے گوناگوں احکام لے کر نازل ہوا، جس چیز کا نزول اس طرح ہوا ہو اس میں کسی قسم کا ربط و نظم نہیں ہو سکتا"

یہ علماء کے دو مختلف مذہب ہیں اور دونوں مذہبوں کے حامی و موئید موجود ہیں۔ میرے نزدیک پہلا مذہب صحیح ہے اور میں اس کا پیرو ہوں۔ اس تفصیل سے میں دو باتیں واضح کرنی چاہتا ہوں۔ ایک یہ کہ یہ ایسی چیز نہیں ہے جس سے علماء نے یک قلم سکوت کیا ہو بلکہ بعضوں نے اس کی طرف نہایت اہتمام کے ساتھ توجہ کی ہے۔ دوسری یہ کہ ایک تنگ راہ ہے جس کے چلنے والے تھوڑے ہیں اور ایک ایسا مدفون خزانہ ہے جس کا بہت قلیل حصہ دریافت ہو سکا ہے۔ مجھ پر نظم کا دروازہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے، سب سے پہلے سورۂ بقرہ اور سورۂ قصص میں کھولا۔ اور اس کی طرف رہنمائی باہر سے نہیں بلکہ خود قرآن کے اندر سے ہوئی۔ میں قرآن کی تلاوت کا دلدادہ تھا اور اللہ تعالیٰ کا شکر گذار ہوں کہ میرے لیے سب سے زیادہ محبوب اور لذیذ کتاب یہی ہے۔ میں سُنا کرتا تھا کہ قرآن مجید چونکہ مختلف اوقات و حالات میں تھوڑا تھوڑا نازل ہوا ہے اس لیے نظم کے اعتبار سے سب سے زیادہ منتشر کتاب ہے لیکن جب دو سورتوں میں مجھے نظم معلوم ہو گیا تو بقیہ سورتوں پر غور کرنے کی تحریک ہوئی۔ یہ اس زمانہ کا قصہ ہے جب میں ابتدائی زندگی کی مشغولیتوں میں منہمک تھا اور اس طرح کے کام کے لیے بہت کم وقت بچا سکتا تھا۔ اس طرح دس سال سے کچھ زیادہ کی مدت گذر گئی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق نے میری دست گیری فرمائی اور میں نے قرآن پر ایک طرف سے، اس نقطۂ نظر سے، غور کرنا شروع کیا اور سال بھر کی مدت میں اس کو تمام کیا۔ اسکے بعد یہ خیال ہوا کہ اپنے فکر و تدبر کا نتیجہ لوگوں کے سامنے پیش کروں لیکن ایک عظیم ذمہ داری اور اسکے دور رس نتائج کے ہیبتناک احساس نے مجھے ڈرا دیا۔ چنانچہ ایک طویل مدت تک میں قرآن مجید

پر بار بار غور کرتا رہا اور اللہ تعالیٰ سے برابر دعا مانگتا رہا کہ وہ مجھے نفس کی شرارتوں اور جہل کی آفتوں سے محفوظ رکھے اور ہر چند کہ حقیقت ایک عرصہ سے میرے سامنے بالکل غیر مستور تھی لیکن میری دلی خواہش یہی تھی کہ میں اسکے اظہار کی مسئولیت اور اس کے خشک و تر اور خیر و شر کی ذمہ داریوں سے بچا لیا جاؤں۔ لیکن مختلف اسباب نے مجھے مجبور کیا کہ اس ذمہ داری کے اُٹھانے سے گریز نہ کروں۔

۱- سب سے پہلی چیز جس نے مجھے اس ذمہ داری کے لیے مجبور کیا یہ ہے کہ میں نے دیکھا کہ تاویل کا بیشتر اختلاف نتیجہ ہے اس بات کا کہ لوگوں نے آیات کے اندر نظم کا لحاظ نہیں رکھا۔ اگر نظم ظاہر ہوتا اور عمود کلام سامنے آجاتا تو سب ایک جھنڈے کے نیچے جمع ہو جاتے اور سب کے منہ سے ایک ہی صدا بلند ہوتی کَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ (ایک بار آور درخت کے مانند جسکی جڑ زمین کے اندر دھنسی ہوئی اور جس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہوں) اور سارے مسلمان اللہ کے رشتہ کو مضبوط ہو کر تھام لیتے جیسا کہ فرمایا ہے: وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا (اور سب ملکر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑو اور منتشر نہ ہو)۔ لیکن جب صورت حالات اسکے بالکل برعکس ہے اور لوگوں نے اس حبل اللہ المتین کو جس کی تعریف یہ ہے کہ (لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ الآیہ) ٹکڑے ٹکڑے سمجھ رکھا ہے تو اس تفرق سے نجات کی کیا شکل ہے؟ حالت یہ ہے کہ ہر فریق اپنے خیال کے مطابق قرآن کی تاویل کرتا ہے اور کلام کو اسکی صحیح سمت سے ہٹا کر جس وادی میں چاہتا ہے گھسیٹتا ہے اور نظم کلام، جو صحیح سمت کو متعین کرنے والی چیز ہے اور جس سے اہل بدعت اور اصحاب زیغ و تحریف کی کجرویوں کی اصلاح ہو سکتی ہے وہ بیچ سے بالکل غائب ہے۔

۲- دوسری چیز جو اسکے لیے محرک ہوئی وہ ملحدین کا طعن ہے۔ انھوں نے قرآن مجید پر بے نظمی کا الزام لگایا اور میں نے دیکھا کہ علماء اسلام بجائے اسکے کہ حق کی شہادت دیں اور کتاب الٰہی سے اس الزام کو دفع کریں، اسی قسم کی باتیں خود بولنے لگے جس قسم کی باتیں یہ ملحدین و مارقین کہہ رہے تھے کَبُرَتْ كَلِمَةً

تُخْرِجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَلَنْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا۔ ایسی حالت میں میرے لیے ممکن نہ تھا کہ میں حق کو سرنگوں اور باطل کو سربلند دیکھتا رہوں اور پھر خاموش رہوں۔ بالخصوص جبکہ میں پورے یقین کے ساتھ محسوس کر رہا تھا کہ یہ اعتراض بالکل باطل ہے۔

۳۔ علاوہ ازیں یہ امر ہر شخص کو معلوم ہے کہ نظم کلام، کلام کا ایک جزو ہوتا ہے۔ اگر اسکو چھوڑ دیجیے تو کلام کے مفہوم و معنی کا ایک حصہ غائب ہو جائیگا۔ ترکیب میں ایک زائد حقیقت ہوتی ہے جو متفرق اجزاء کی دسترس سے بالاتر ہوتی ہے۔ انگور اور شراب ایک ہی چیز نہیں ہے۔ اس سبب سے اگر کوئی شخص فہم نظام سے محروم رہجائے تو اسکے معنی یہ ہیں کہ خود کلام کی ایک بڑی حقیقت اس سے اوجھل رہ گئی اور عجب نہیں کہ وہ اہل کتاب کی اُس صف سے جا ملے جس کا حال قرآن نے یوں بیان کیا ہے کہ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ (پس انھوں نے ایک بڑا حصہ اس کتاب کا فراموش کر دیا جسکے ذریعہ سے انکو یاد دہانی کی گئی تھی نتیجہ یہ نکلا کہ ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لیے دشمنی اور جھگڑے کی آگ بھڑکا دی)۔ مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ ممکن ہے یہ عداوت اور بغض جسکی وبا آج مسلمانوں میں پھوٹ پڑی ہے اسی طرح کے نسیان کا نتیجہ ہو۔ اگر ایسا ہے تو اس فتنہ کا دبنا مشکل ہے۔ اسکی وجہ جیسا کہ اوپر بیان ہوئی ہے کہ جب کلام الٰہی کے معانی کے باب میں ہماری رائیں مختلف ہو جائینگی تو لازماً ہماری خواہشیں اور ہمارے ارادے بھی مختلف ہو جائینگے اور ہمارا حال وہی ہو جائیگا جو اہل کتاب کا ہوا۔ صرف یہ فرق ہوگا کہ انکے لیے آخری بعثت اور آخری صحیفہ کے ذریعہ سے اصلاح حال کا موقع باقی تھا اور ہمارے لیے آخری چارہ کار صرف یہی قرآن ہے۔

تالیف و ترکیب کے یہی فوائد مقتضی ہوئے کہ انسانی فطرت کے ضعف کے سبب سے جیسا کہ وَلَقَدْ عَهِدْنَا اِلٰى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ الآیہ کے سلسلہ میں بیان ہوا ہے، جو آیتیں بطور تخفیف کے نازل ہوئیں ان کو اپنے باب کے سابق احکام کے پہلو میں جگہ دی جائے۔ اسکی تصدیق اگلی آن خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ

ضَعۡفًا الآیہ سے ہوتی ہے۔ یہ آیت اپنے سابق حکم کے پہلو میں رکھی گئی ہے۔ اسی طرح سورۂ مزمل کی آخری آیت ابتدائی آیات کے بہت بعد نازل ہوئی ہے لیکن رکھی وہیں گئی جہاں اس باب کے سابق احکام موجود تھے۔ یہی حال اُحِلَّ لَكُمۡ لَيۡلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ الآیہ کا ہے۔ اسی طرح آیت وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوۡنَ مِنكُمۡ وَيَذَرُونَ أَزۡوَاجًا الآیہ بعد میں تتمہ نازل ہوئی اور رعایت اہتمام کی وجہ سے جیسا کہ آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں ہم نے بالتفصیل بیان کیا ہے، پہلے تتمہ کے بعد رکھی گئی۔ اس طرح کی آیات کے بعد بالعموم یہ آیت آتی ہے كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ ٱللَّهُ ءَايَٰتِهِۦ لِلنَّاسِ (اور اسی طرح اللہ لوگوں کے لیے اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کرتا ہے)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ درحقیقت اُس وعدہ کا ایفاء ہے جو اللہ تعالیٰ نے سورہ قیامہ میں فرمایا ہے ثُمَّ إِنَّ عَلَيۡنَا بَيَانَهُۥ (پھر ہمارے اوپر اسکو واضح کرنا ہے)، اور اُس دعا کی استجابت ہے جو سورہ طٰہٰ میں مذکور ہوئی رَّبِّ زِدۡنِي عِلۡمٗا۔ (میرے پروردگار میرے علم کو زیادہ کر)۔

ہمارا یہ استنباط قرآن سے تھا۔ اسکی تائید احادیث سے بھی ہوتی ہے۔ روایات میں ہے کہ جب کوئی آیت اُترتی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم حکم دیتے کہ اسے فلاں سورت میں فلاں جگہ رکھا جائے اور وہ اسی جگہ رکھی جاتی۔ اسی طرح یہ بھی روایات میں ہے کہ جب سورہ تمام ہوجاتی، حضرت جبرئیل امین آنحضرت صلعم کو پوری سورہ ازسرِنو سنا دیتے۔ ہمارے نزدیک یہی وہ جمع کرنا اور پڑھنا ہے جس کا ذکر سورہ قیامہ میں ہوا ہے اور جسکی پیروی کا آنحضرت صلعم کو حکم ہوا تھا۔

علاوہ ازیں یہ امر محتاج بیان نہیں کہ جہاں تک ترتیب آیات کا تعلق ہے، اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے اس بارہ میں امت کے اندر کوئی اختلاف نہیں ہے۔ مسلمانوں کے جس قدر فرقے ہیں، سب کے پاس قرآن مجید اسی ترتیب کے ساتھ موجود ہے۔

پھر سب سے بڑھ کر ان لوگوں کا علم و اذعان ہے جن پر حسن ترتیب کے محاسن کچھ بے نقاب ہوجاتے

ہیں اور جو ان معارف و غوامض کی کوئی تجلی دیکھ لیتے ہیں جو نظام قرآن کے اندر ودیعت ہیں۔ یہ لوگ جانتے ہیں کہ کتاب اللہ کے اسرار و عجائب کا کیسا عظیم الشان خزانہ ہے جسکی کلید صرف نظم ہے۔ یہ چیز ان کے ذوقِ جستجو کو شہ دیتی اور ان کی طمانیت و بصیرت میں اضافہ کرتی ہے اور وہ کوشش کرتے ہیں کہ اس مخفی خزانہ کو اجاگر کریں۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس سعی کو بامراد کرتا ہے اور جتنا ان کے مقدر میں ہوتا ہے وہ اس میں سے پاتے ہیں۔ جو دروازے کھلتے جاتے ہیں ان کے لیے وہ اللہ تعالیٰ کے شکر گذار ہوتے ہیں اور جو دروازے نہیں کھلتے ان کو اپنی قلت علم و نارسائی فہم پر محمول کرتے ہیں۔ کیونکہ معلوم ہے کہ کتاب الٰہی ایک سمندر ہے جسکے عجائب کبھی ختم نہیں ہونگے۔ کوئی شخص آفتاب کو اپنے احاطہ میں نہیں لے سکتا۔ پس آدمی قرآن کے معاملہ میں کبھی غلطی سے مامون نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ چیز ان کے شوق و طلب کی سرگرمی کو مضمحل نہیں کرتی۔ ان کا ذوقِ جستجو برابر مشتعل رہتا ہے۔ اور جس نے بھی اس علم میں سے کوئی حصہ پایا اس نے اس نعمتِ عظمیٰ پر تحدیث کی امام سیوطیؒ اپنی کتاب میں نقل کرتے ہیں۔

"پہلے شخص جنھوں نے علم مناسبت (علم نظم) کو ظاہر کیا شیخ ابو بکر نیشاپوری ہیں۔ فقہ و ادب میں ان کا بڑا رتبہ تھا۔ ان کے لیے منبر رکھا جاتا جس پر بیٹھ کر قرآن کی آیتوں کی شرح کرتے۔ اور فرماتے کہ فلاں آیت فلاں آیت کے پہلو میں کیوں رکھی گئی اور فلاں سورت کے فلاں سورت کے ساتھ رکھنے میں کیا حکمت ہے، اور علمائے بغداد کی تنقیص کرتے کہ یہ لوگ نظم کے علم سے بالکل محروم ہیں۔"

امام سیوطیؒ نے ابنِ عربی کا یہ قول بھی نقل کیا ہے۔

"آیات قرآن کا ایسا باہمی تعلق کہ وہ ایک مسلسل اور مربوط کلام کے قالب میں ڈھل جائیں ایک عظیم الشان علم ہے۔ صرف ایک عالم نے اس علم سے تعرض کیا ہے۔ اسی اصول پر اس نے پوری سورہ بقرہ کو منظم کیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضلِ خاص سے ہم پر یہ دروازہ

کھوہ - لیکن ہم نے اس علم کے حامل نہیں پائے - ساری دنیا دون ہمتوں اور کاہلوں سے بھری ہے - پس ہم نے اسکو مہر بند ہی رکھا اور اپنے اور اپنے خدا کے درمیان کے معاملہ کو اُسی کی طرف لوٹا دیا۔"

یہی حال امام رازیؒ کا ہے - وہ بھی جگہ جگہ تفسیر میں اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں مخدوم مہائمی رحمۃ اللہ کی تفسیر کا موضوع ہی نظم ہے - انھوں نے اس نعمت کی عظمت کا جن لفظوں میں اعتراف کیا ہے اور اس کے مقابل میں اپنی بے مایگی اور آلودگی کا جس درجہ انکو احساس ہے اسکے بیان کی ضرورت نہیں ہے - وہ اس علم کو محض فضل الٰہی کی بخشش قرار دیتے ہیں اور اسی احساس کے ماتحت انھوں نے اپنی کتاب کا نام تبصیر الرحمان وتیسیر المنان رکھا ہے -

جن لوگوں نے اس علم میں سے کوئی حصہ پایا انکی نگاہوں میں اس کا یہ درجہ ہے - ظاہر ہے کہ یہ اعترافات انکی زبانوں سے اسی وقت نکلے ہونگے جب انھوں نے بالیقین اسکو محسوس کر لیا ہوگا کہ قرآن مجید کی آیتیں ایک نادر اسلوب کے ساتھ مرتب ہیں جیسا کہ شیخ ولی الدین ملوی نے کہا ہے -

"جو لوگ کہتے ہیں کہ قرآن مجید کی آیتوں میں اس لیے نظم نہیں تلاش کرنا چاہیے کہ وہ مختلف وقتوں میں مختلف حالات کے ماتحت نازل ہوئی ہیں وہ غلط کہتے ہیں - ٹھیک بات یہ ہے کہ وہ نزول کے پہلو سے تو واقعات کے لحاظ سے ہیں لیکن ترتیب کے پہلو سے بالکل مطابق حکمت ہیں۔"

اور ظاہر ہے کہ جو شخص قرآن کے اندر اس کی جھلک پاتا ہو، اس کے جلوے دیکھتا ہو، اور اسکو اپنے دونوں ہاتھوں سے چھوتا ہو وہ اس چیز کا کیسے انکار کر سکتا ہے ؛ ہاں جس نے اس کا مزہ ہی نہ چکھا ہو وہ اگر اس کا انکار کر دے تو کچھ قابل الزام بھی نہیں -

جو چیز مجھے لوگوں کے سامنے لانی ہے اسکے متعلق اس طولِ بیان کی چنداں ضرورت نہیں تھی لیکن میں نے یہ تمہید اس لیے ضروری سمجھی کہ نظم کی جستجو تدبر کی محتاج ہے اور اگر تمہارے دماغ میں

یہ بات جاگزیں ہے کہ قرآن مجید میں نظم نہیں ہے تو اس رائے کے ساتھ اس دشوار گذار وادی میں ایک قدم بھی اٹھانا مشکل ہوگا۔ ہر چیز تمہیں بیگانہ معلوم ہوگی اور اس میں سر کھپانا طبیعت پر بہت بار ہوگا۔ ایک بات تم البتہ پوچھ سکتے ہو کہ اگر نظم ایسی عظیم الشان اور کثیر المنفعت چیز تھی تو آخر صحابہؓ نے اسکے متعلق کیوں سکوت اختیار فرمایا اور نبی صلعم نے اسکی توضیح کیوں نہیں فرمائی؟ ہماری طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ آیات کا موقع و محل صحابہؓ کے سامنے بالکل واضح تھا۔ وہ تمام تر انہی کے حالات اور انہی کے پیش نظر معاملات سے متعلق تھیں۔ اگر ہم بھی اس عہد میمون میں ہوتے تو ان کا نظم ہمارے لیے بھی بالکل واضح ہوتا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ صحابہؓ سے تفسیر بہت کم منقول ہے۔ زبان ان کی تھی، اسلوب ان کے تھے، اور معاملات و حالات ان کے تھے۔ ان چیزوں میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو ہمارے اور ان کے درمیان مشترک ہو پھر نظم کے سمجھنے میں ہمارا اور ان کا حال یکساں کیسے ہو سکتا ہے؟ لیکن اس نمایاں فرق کے باوجود یہ ضرور ہے کہ کلام کی لپیٹ اور اس کی تہوں کے اندر ایسے اشارات موجود ہوتے ہیں جو آگے کی طرف انگلی اٹھاتے رہتے ہیں اور اگر آدمی بلید نہ ہو بلکہ کلام کے تمام اطراف میں پھیل کر آگے بڑھے تو یہ اشارات نظم کو بے نقاب کر دیتے ہیں۔

یہ ہم نے اپنی تفسیر کے ایک بنیادی اصول نظم سے متعلق کہا ہے۔ اور یہاں اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ آگے مقدمات تفسیر کے سلسلہ میں بعض مفید مطلب اشارات اور ملینگے۔ اب چند باتیں دوسرے اصول ـــــ تفسیر آیات بالآیات ـــــ کی نسبت لکھتے ہیں علامہ سیوطیؒ اتقان میں فرماتے ہیں۔

"علماء نے کہا ہے کہ جو کتاب عزیز کی تفسیر کرنا چاہے، اسکو چاہیے کہ وہ سب سے پہلے قرآن کی تفسیر قرآن سے کرے۔ قرآن میں جو چیز ایک جگہ مجمل ہے وہی چیز دوسری جگہ شرح و بسط کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ ابن جوزیؒ نے خاص اس عنوان پر ایک کتاب لکھی ہے جس میں قرآن کے ان مطالب سے تعرض کیا ہے جو ایک جگہ مجمل ہیں اور دوسری جگہ مفصل۔ میں نے بھی مجمل کے باب

میں اسکی بعض مثالوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اگر قرآن سے تفسیر نہ ہو سکے تو سنت رسولؐ کی طرف رجوع کرے کیونکہ سنت قرآن کی شارح اور مفسر ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ کا قول ہے کہ نبی صلعم نے جو کچھ حکم فرمایا ہے سب قرآن سے ماخوذ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ (ہم نے تمہاری طرف کتاب اتاری ہے قول فیصل کے ساتھ تاکہ تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو اس چیز کے ذریعہ سے جو اللہ نے تمکو دکھائی) اس کے علاوہ اور بھی آیتیں ہیں۔ خود نبی صلعم نے فرمایا ہے "مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اسی کے مانند ایک اور چیز بھی اس کے ساتھ" یعنی سنت[1]۔ لیکن اگر سنت سے تفسیر نہ ہو سکے تو صحابہؓ کے اقوال کی طرف رجوع کرے انھوں نے چونکہ تمام قرائن وحالات کا بوقت نزول مشاہدہ کیا ہے نیز فہم کامل، علم صحیح اور عمل صالح سے مشرف ہیں اس لیے وہ تفسیر کے سب سے بڑے جاننے والے ہو سکتے ہیں"

اس سے مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ پہلی چیز جو قرآن کی تفسیر میں مرجع کا کام دے سکتی ہے وہ خود قرآن ہے۔ اس کے بعد نبی صلعم اور آپ کے اصحاب کا فہم ہے۔ پس میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مجھے سب سے زیادہ محبوب وہی تفسیر ہے جو پیغمبر صلعم اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہو۔

بعض علماء نے اپنی کتابوں کی بنا روایات پر رکھی ہے مثلاً ابن جریر طبریؒ، جسکی تفسیر کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ اسکے مثل کوئی اور تفسیر نہیں لکھی گئی، لیکن اس میں اکثر حدیثیں ضعیف ہیں، مرفوع احادیث کا حصہ بہت تھوڑا ہے۔ انہوں نے تو دراصل اہل تاویل کے اقوال تمام اختلافات کے ساتھ جمع کر دیے ہیں۔

میں یقین رکھتا ہوں کہ صحیح احادیث میں اور قرآن میں کوئی تعارض نہیں ہے تاہم میں روایات کو بطور اصل نہیں بلکہ بطور تائید کے پیش کیا کرتا ہوں۔ پہلے آیت کی تاویل مماثل آیات سے کرتا ہوں اسکے

[1] "مثلہ معہ" کی یہ تفسیر امام شافعیؒ نے فرمائی ہے۔ (۱۸) مگر ہمارے نزدیک اس سے مراد فہم و بصیرت اور وہ روشنی ہے جس سے

بعد تبعاً احادیث صحیحہ کا ذکر کرتا ہوں تاکہ ان منکرین کو معارضہ کی راہ نہ ملے جنھوں نے قرآن کو پس پشت ڈال دیا ہے اور وہ ملحدین کوئی اعتراض نہ کرسکیں جو ہمارے سر ایسی چیزیں تھوپتے ہیں جنکی قرآن میں کوئی اصل نہیں ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ یہ کتاب مسلمانوں کے تمام فرق کے درمیان ایک حجت قاطع اور مرکز جامع کی حیثیت سے کام دے۔

میری یہ خواہش نہیں ہے کہ جو کچھ قرآن سے تعلق رکھتا ہے وہ سب کا سب اس کتاب میں جمع کردوں۔ قرآن مجید ایک ایسا خزانہ ہے جو طالبوں کی کثرت کے باوجود کبھی ختم نہیں ہوسکتا۔ تفسیر کی کتابیں بہت ہیں۔ جو شخص انکو بنگاہِ تحقیق دیکھیگا وہ اس علم میں سے اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق حصہ پائیگا۔ میرے پیشِ نظر تو ایک ایسی کتاب کی تالیف ہے جو بنیاد اور مرکز کا کام دے اور نقطۂ اعتدال اور قول فیصل کی حیثیت سے نمودار ہو۔ اس لیے میں نے صرف اُتنے ہی پر اکتفا کیا ہے جتنا قرآن میں ہے۔ لیکن اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ جو کچھ میں نے چھوڑ دیا ہے اس کا منکر ہوں۔ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب میں وہ روایتیں جمع کیں جو انکے اصول پر پوری اُتریں اور بہت سی صحیح روایتیں چھوڑ دیں۔ اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ انکے منکر ہیں۔ بلکہ میں تو اپنی اس کتاب میں ان حقائق و معارف کا عشرِ عشیر بھی نہیں بیان کرسکا جو خود قرآن کے اندر مستور ہیں لیکن اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو میں ان کے لیے ایک علیحدہ کتاب لکھوں گا اور اس میں حتی الامکان ان معارف کو سمیٹنے کی کوشش کروں گا وھو الملہم للحق والصواب۔

قرآن کے پورے تمسک کے ساتھ ساتھ جس طرح میں روایات کو تبعاً ذکر کرتا ہوں اسی طرح ان کتابوں کی شہادتیں بھی پیش کرتا ہوں جو قرآن سے پیشتر نازل ہوئی ہیں اور اس سے مقصود قرآن کے ساتھ انکی موافقت کو دکھانا اور یہود و نصاریٰ پر خود انکی کتابوں سے حجت پیش کرنا ہے۔ دیباچہ کتاب میں اتنی تفصیل کافی ہے، لیکن بعض امور مہمہ ایسے ہیں جنکے ذکر کی ضرورت باقی ہے۔ تو ان

کے لیے ان مقدمات میں جگہ نکالی ہے جو تفسیر کے شروع میں لکھ دیے ہیں تاکہ اثنائے تفسیر میں جہاں ضرورت پیش آئے ان کا حوالہ دیدیا جائے اور انکی بار بار کی تکرار سے سلسلہ کلام میں کوئی برہمی نہ پیدا ہو - پوری کتاب ۱۱۴ اقساط میں ہے - ہر سورہ کے لیے ایک قسط مخصوص ہے - یہ جو کچھ بھی لکھ سکا ہوں سب اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے اور تمام فضل و احسان کا سرچشمہ اسی کی ذات ہے - اگر میں نے کوئی صحیح بات کہی ہے تو اسکا لطف و کرم ہے والا فکان کما کانت حاجۃ فی نفس یعقوب قضاہا -

مقدمہ (۱)

شان نزول

شان نزول کا مطلب، جیسا کہ بعض لوگوں نے غلطی سے سمجھا ہے، یہ نہیں ہے کہ وہ کسی آیت یا سورہ کے نزول کا سبب ہے - بلکہ اس سے مراد لوگوں کی وہ حالت و کیفیت ہے جس پر اس کلام کا برمحل اطلاق ہوتا ہے - کوئی سورۃ ایسی نہیں ہے جس میں کسی خاص امر یا امور کو مدنظر رکھے بغیر کلام کیا گیا ہو اور وہ امر یا امور جنکو کسی سورہ میں مدنظر رکھا گیا ہے، عمود سورہ ہی کے تحت مندرج ہوتے ہیں - لہذا اگر تم کو شان نزول معلوم کرنی ہو تو اسکو خود سورہ سے معلوم کرو - کیونکہ کلام کا اپنے موقع و محل کے مناسب ہونا ضروری ہے - جس طرح ایک ماہر طبیب دوا کے نسخہ سے اس شخص کی بیماری معلوم کر سکتا ہے جسکے لیے نسخہ لکھا گیا ہے اسی طرح تم سورہ سے سورہ کا شان نزول خود معلوم کر سکتے ہو - اگر کلام میں کوئی خاص موضوع پیش نظر ہے تو اس کلام اور موضوع میں وہی مناسبت ہوگی جو مناسبت لباس اور جسم میں بلکہ جلد اور بدن میں ہوتی ہے - اور یہ قطعی ہے کہ کلام کے تمام اجزا رباہمدگر مربوط و متصل ہوں گے - اور یہ جو روایتوں میں آتا ہے کہ فلاں فلاں آیتیں فلاں فلاں معاملات کے بارہ میں نازل ہوئیں تو اسکے معنی یہ ہوتے ہیں کہ سورہ کے نزول کے وقت یہ یہ احوال و مسائل درپیش تھے تاکہ معلوم ہو کہ سورہ کے نزول کے لیے کیا محرکات اور دواعی موجود تھے - علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں -

"زرکشیؒ نے برہان میں لکھا ہے کہ صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم کی یہ عام عادت ہے کہ جب وہ کہتے ہیں کہ فلاں آیت فلاں بارہ میں نازل ہوئی تو اسکا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ آیت اس حکم پر مشتمل ہے۔ یہ مطلب نہیں ہوتا کہ بعینہ وہ بات اس آیت کے نزول کا سبب ہے۔ یہ گویا اس حکم پر اس آیت سے ایک قسم کا استدلال ہوتا ہے، اس سے مقصود نقل واقعہ نہیں ہوتا۔ میں کہتا ہوں اسباب نزول میں ایک قابل لحاظ چیز یہ بھی ہے کہ ضروری نہیں کہ آیت اُسی زمانہ میں نازل ہوئی ہو جس زمانہ میں واقعہ پیش آیا۔"

زرکشیؒ کے اس بیان سے وہ مشکل حل ہو جاتی ہے جس کا ذکر امام رازیؒ نے سورۂ انعام میں وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا الآیہ کی تفسیر کے ذیل میں کیا ہے۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں۔

"مجھے یہاں ایک سخت اشکال پیش آیا ہے۔ وہ یہ کہ لوگ اس امر پر متفق ہیں کہ یہ پوری سورہ بیک دفعہ نازل ہوئی تھی۔ اگر صورت معاملہ یہ ہے تو پھر ہر آیت کے بارہ میں یہ کہنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ اسکا سبب نزول فلاں واقعہ ہے۔"

پس ہمارے نزدیک، جیسا کہ اوپر کے مباحث سے واضح ہوا، صورت معاملہ یہ ہے کہ جس وقت جو سورۃ بھی نازل کی گئی ہے اس غرض کے لیے نازل کی گئی ہے کہ جو معاملات محتاج توضیح و تشریح ہیں اُن کی توضیح و تشریح کر دی جائے اور کلام ایسا ہو کہ اس کے نظم میں کسی قسم کا التباس و ابہام نہ ہو۔ جس طرح ایک ماہر اور حکیم خطیب اپنے سامنے کے خاص حالات و مقتضیات کی بنا پر ایک خطبہ دیتا ہے کہ بسا اوقات وہ ایک خاص معاملہ کا ذکر نظر انداز کر دیتا ہے لیکن اس کا کلام اُس طرح کے تمام احوال و معاملات پر حاوی ہوتا ہے، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ کسی خاص معاملہ یا کسی خاص شخص کا ذکر کرتا ہے لیکن کلام ایک عالمگیر بارش کی طرح بالکل حاوی و ہمہ گیر ہوتا ہے۔

اسی طرح قرآن حکیم کا نزول بھی ہوا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید سے خود مترشح ہوتا ہے۔ فرمایا وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ۔ اور اگر تم ان کے متعلق ایسے وقت میں سوال کرو گے جبکہ قرآن نازل ہو رہا ہے تو وہ ظاہر کر دی جائینگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن عین اپنے وقت نزول میں سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے، لوگوں کے سوالوں کے جواب دیدیتا تھا۔ اس طرح جب ایک سورہ اپنی حد کو پہنچ جاتی اور کلام کے تمام دواعی و مقتضیات پورے ہو جاتے تو وہ سورۃ تمام کر دی جاتی اور نا ممکن تھا کہ وہ اپنے حدود اقتضاء سے ذرا بھی کم و بیش ہو۔ لیکن بسا اوقات ضرورت باقی رہ جاتی تھی۔ اس وقت دوسری سورۃ نازل کی جاتی۔ شان نزول وہی ہوتا لیکن اسلوب میں تبدیلی کر دی جاتی کہ یکسانی و یکرنگی ذوق پر بار نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائے بعثت کی بہت سی سورتوں میں بعث، توحید، تصدیق رسول اور اس سے ملتے جلتے ہوئے مضامین ملتے ہیں۔ صرف اسلوب اور طرز بیان کا فرق ہے۔ اسی طرح کبھی ایسا ہوتا کہ ضرورت کسی امر کی توضیح و تشریح کی داعی ہوتی، اس وقت کوئی آیت اترتی اور جہاں ضرورت ہوتی وہیں رکھدی جاتی۔ یہ اس وعدہ کی تکمیل ہوتی جس کا ذکر سورۂ قیامہ میں فرمایا ہے۔ ثم ان علینا بیانہ (پھر ہمارے ذمہ ہے اس کی توضیح کرنا) ایسے مواقع پر زمانہ نزول کا لحاظ نہ ہوتا بلکہ نظم کلام کا لحاظ کیا جاتا۔ اور بالعموم اس قسم کی آیات کے بعد یہ تنبیہ بھی کر دی جاتی کہ یہ آیت بطور تشریح نازل ہوئی ہے چنانچہ جو آیتیں اصل احکام کے ساتھ بطور تفسیر ملائی گئی ہیں ان کے بعد بالعموم، جیسا کہ ہم نے دیباچہ میں ذکر کیا ہے، یہ آیت آئی ہے۔ کذلک یبین اللہ آیاتہ للناس لعلھم یتقون۔

پس اگر تم طمانیت اور یقین کے طالب ہو تو شان نزول کی تلاش میں سررشتہ نظم کو ہرگز ہاتھ سے نہ چھوڑنا ورنہ تمہاری مثال صحرا کے اس مسافر کی ہوگی جو اندھیری رات میں ایک چوراہے پر پہنچ گیا ہے اور نہیں جانتا کہ اب کدھر جائے۔ شان نزول خود قرآن کے اندر سے اخذ کرنا چاہیے اور

احادیث و روایات کے ذخیرہ میں سے صرف وہ چیزیں لینی چاہئیں جو قرآن کی تائید کریں نہ کہ اس کے تمام نظام کو درہم برہم کردیں۔ پھر سب سے زیادہ لایق اہتمام چیز وہ شان نزول ہے جو نظم سے مترشح ہوتا ہو۔ اس کو پوری مضبوطی سے پکڑو۔ کیونکہ جب کوئی حکم عام کسی خاص حالت و صورت میں نازل ہوتا ہے تو وہ حالت و صورت حکم کی حکمت و علت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ مثلاً قرآن میں تعدد ازدواج اور وحدت ازواج کا حکم ہے۔ اب اگر تم اس شان نزول کو سامنے رکھو جو نظم کلام سے نکلتا ہے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ پہلا حکم یتامیٰ کے ساتھ انصاف کے مقصد سے ہے اور دوسرا حکم بیویوں کے ساتھ انصاف کے مقصد سے ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان جامع رشتہ قسط بالضعفاء ہے، اور ان میں سے ترجیح اس حق کو ہوگی جو مقدم ہے۔ یہی حال رہن کے معاملہ کا ہے۔ کسی مسلمان کا مال گرو رکھنا ایک نہایت دنارت کی بات ہے۔ پس ضرورت کے لیے اسکی اجازت دی اور ضرورت رفع ہوجانے کے بعد اسکے لوٹا دینے کا حکم دیا۔ اس اجمالی اشارہ کی تفصیل بقرہ کی آیت ۲۸۳ کے ماتحت ملیگی۔

مقدمہ (۲)

تفسیر کے خبری ماخذ

بعض ماخذ اصل و اساس کی حیثیت رکھتے ہیں اور بعض فرع کی۔ اصل و اساس کی حیثیت تو صرف قرآن کو حاصل ہے اسکے سوا کسی چیز کو حاصل نہیں ہے۔ باقی فرع کی حیثیت سے تین ہیں (۱) احادیث (۲) قوموں کے ثابت شدہ اور متفق علیہ حالات (۳) گذشتہ انبیاء کے صحیفے جو محفوظ ہیں۔ اگر احادیث، تاریخ اور قدیم صحیفوں میں ظن اور شبہ کو دخل نہ ہوتا تو ہم ان کو فرع کے درجہ میں نہ رکھتے بلکہ سب کی حیثیت اصل کی ہوتی اور سب بلا اختلاف ایک دوسرے کی تائید کرتے۔ پس جو شخص قرآن مجید کو سمجھنا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ روایات کے ذخیرہ

میں سے اُن روایات کو نہ لے جو اصل کو ڈھاتی ہوں۔ بعض روایتیں ایسی ہیں جنکی اگر تاویل نہ کی جائے تو انکی زد براہ راست اصل پر پڑتی ہے اور اُن سے سلسلہ نظم درہم برہم ہوتا ہے۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ بہت سے لوگ آیت کی تاویل کر ڈالتے ہیں لیکن روایت کی تاویل کی جرأت نہیں کرتے اور بسا اوقات تو صرف آیت کی تاویل ہی پر بس نہیں کرتے بلکہ اسکے نظام کی بھی قطع و برید کر ڈالتے ہیں حالانکہ جب اصل و فرع میں تعارض ہو تو کاٹنے کی چیز فرع ہے نہ کہ اصل۔

وکاین رأینا من فروع طویلۃ تموت اذا لم تحیہن اصول

اور سب سے زیادہ تعجب ان لوگوں پر ہے جو ایسی روایات تک قبول کر لیتے ہیں جو نصوص قرآن کی تکذیب کرتی ہیں۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جھوٹ بولنے کی روایت، یا آنحضرت صلعم کے خلافِ وحی قرآن پڑھ دینے کی روایت۔ اس طرح کی روایات کے بارہ میں ہم کو نہایت محتاط ہونا چاہیے۔ صرف وہ روایتیں قبول کرنی چاہئیں جو قرآن کی تصدیق و تائید کریں۔ مثلاً جو آثار حضرت ابنِ عباسؓ سے منقول ہیں وہ بالعموم نظم قرآن سے بہت اقرب ہیں۔ پس اس طرح کی روایات کی طرف ہم تبعاً اشارہ کرینگے۔ اسی طرح اہل کتاب کی جو روایات ہمارے ہاں پھیلی ہوئی ہیں اُن کے مقابل میں خود اہل کتاب کی تاریخ قابل ترجیح ہے کیونکہ مفسرین نے بالعموم یہ روایتیں عوام کی زبانی لی ہیں جو بنی اسرائیل اور ان کے انبیاء کی تاریخ سے بہت کم واقف تھے۔ پس بہتر یہ ہے کہ اُن کے بے اصل افسانوں کے بجائے اُن کی معتبر کتابوں کو ہم ماخذ بنائیں اور ان کو تتبع کی حیثیت سے پیش کریں، اور جہاں کہیں وہ قرآن سے مختلف ہوں وہاں انکو چھوڑ دیں کیونکہ یہ قطعی معلوم ہے کہ ان کتابوں میں شہادت کو چھپایا گیا ہے۔ نیز ان کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "ءانتم اعلم ام اللہ" تم زیادہ جانتے ہو کہ اللہ؟ اس طرح کے کتم و تحریف کی نہایت واضح مثال حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ذبح کے معاملہ میں موجود ہے۔ پس لازماً جو کچھ قرآن میں ہے ہم اسی کو اصل قرار دینگے

اس اصول میں کسی کے لیے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ ہم مسلمان آسمانی کتابوں میں کسی قسم کی تفریق جائز نہیں سمجھتے۔ ہمارے نزدیک قرآن انہی میں سے ایک ہے البتہ جب روایت میں اختلاف ہوگا تو ہم کو صحت روایت کے لیے اہتمام کرنا پڑے گا اور اس وقت ہم مجبوراً اسی روایت کو ترجیح دینگے جو سب سے زیادہ صحیح اور معتبر ثابت ہو۔ ہاں اگر باہمد گر کوئی اختلاف نہ ہو تو ہم روایت کی کسوٹی پر جانچ کر ان کتابوں سے بھی لے سکتے ہیں جنکا از روئے روایت کوئی وزن نہیں ہے۔ مثلاً ہم زبور میں سے اس چیز کو لیں گے جسکی طرف قرآن کریم نے اس آیت میں اشارہ کیا ہے۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ۔

ہم نے زبور میں ذکر کے بعد لکھدیا ہے کہ زمین کے وارث ہمارے نیکوکار بندے ہوں گے۔

اور صحف موسیٰ میں سے اس چیز کو اخذ کرینگے جسکی طرف آیت ذیل میں اشارہ کیا گیا ہے۔

إِنَّ هَٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ۔

یہ اگلے صحیفوں میں ہے، ابراہیم و موسیٰ کے صحیفوں میں۔

اسی طرح مندرجہ ذیل قبیل کی آیات کی توضیح کے لیے ہمیں بنی اسرائیل کی تاریخ کی طرف رجوع کرنا پڑے گا:۔

وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ۔

اور ہم نے بنی اسرائیل کو اپنے فیصلہ کی اطلاع دیدی تھی کہ تم زمین میں دو مرتبہ فساد برپا کرو گے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ قرآن مجید اپنی تفسیر کے لیے ان فروع کا محتاج نہیں ہے۔ وہ تمام کتابوں کے لیے خود مرکز و مرجع کی حیثیت رکھتا ہے اور جہاں اختلاف واقع ہو تو اسی کی روشنی جھگڑے کو چکانے والی ہوگی۔ لیکن اگر تم کو قرآن مجید کی تصدیق و تائید کی ضرورت ہو تو ان فروع

کی مراجعت سے تمہارے ایمان اور طمانیت میں اضافہ ہوگا۔ یہی حکمت ہے جسکے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہ حکم دیا ہے۔

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا — کہدو ملک میں سیاحت کرو اور دیکھو

كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ۔ — منکروں کا انجام کیسا ہوا۔

بہرحال جو لوگ اگلے صحیفوں کی مراجعت کرینگے ان کو گوناگوں فوائد حاصل ہوں گے مثلاً ان صحیفوں کے مقابل میں قرآنی تعلیم کی فضیلت واضح ہوگی، اپنی کتابوں میں سے جو کچھ انہوں نے بھلا دیا ہے قرآن کی رہنمائی سے ان کا اعادہ ہوگا، جو کچھ انھوں نے بدل ڈالا ہے اسکا انکشاف ہوگا۔

ایک اور قابل لحاظ امر یہ ہے کہ قرآن سے جو کچھ ثابت ہو اس میں اور فروع سے جو کچھ معلوم ہو اس میں فرق کرنا چاہیے۔ دونوں کو خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ قرآن میں جو کچھ ہے وہ قطعی ثابت ہے اور فروع میں وہم وظن کے لیے بہت کچھ گنجائش ہے۔ پس اگر کوئی شخص فروع میں سے کسی بات کا منکر ہو تو وہ قرآن کے منکر کی طرح نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ خبر اگرچہ متواتر ہو، قرآن کو نہیں منسوخ کر سکتی۔ اسکی یا تو تاویل کرینگے یا اس میں توقف کرینگے لیکن اس کے لیے قرآن کو منسوخ نہیں کرینگے۔ امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور عام اہل حدیث، حدیث کو قرآن کے لیے ناسخ نہیں مانتے اگرچہ حدیث متواتر ہو۔ پس جب یہ ائمہ جو حدیث کے لیے صاحب البیت کی حیثیت رکھتے ہیں اس بات کے قائل نہیں ہوئے تو اس باب میں ہم فقہاء و متکلمین کی رائے کو کوئی وزن نہیں دیتے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اس فتنہ سے امان میں رکھے کہ ہم اس بات کے قائل ہوں کہ رسول، اللہ کے کلام کو منسوخ کر سکتا ہے۔ اس طرح کے مواقع میں تمام تر راویوں کے وہم اور ان کی غلطی کو دخل ہے اور فریقین کے دلائل پر غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ حق کیا ہے۔ یہ مقام اس مسئلہ کی تفصیل

کے لیے موزوں نہیں ہے اس لیے اسی پر بس کرتے ہیں۔ سترہویں مقدمہ میں اسکی کسی قدر توضیح ملے گی۔

مقدمہ (۳)

تفسیر کے لسانی ماخذ

جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس بات کا وعدہ کیا ہے کہ وہ متن قرآن کی حفاظت کرے گا: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (ہم نے ذکر کو اتارا ہے اور ہم ہی اسکی حفاظت کرنیوالے ہیں) اسی طرح اسکی تشریح و بیان کا بھی وعدہ فرمایا ہے: ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (پھر ہمارے ذمہ ہے اس کی وضاحت کرنا)۔ چنانچہ یہ اسی وعدہ کا ایفاء ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عربی زبان کو مٹنے سے محفوظ رکھا اور اس کو ایک زندہ و قائم زبان بنا دیا۔ اسی طرح تمام اصطلاحات شرعیہ مثلاً نماز، زکوٰۃ، جہاد، روزہ، حج، مسجد حرام، صفا، مروہ اور مناسک حج وغیرہ اور ان کے ساتھ جو اعمال متعلق ہیں، تواتر و توارث کے ساتھ، سلف سے لیکر خلف تک سب محفوظ رہے۔ اس میں جو معمولی جزوی اختلافات ہیں وہ بالکل ناقابل لحاظ ہیں۔ شیر کے معنی سب کو معلوم ہیں، اگرچہ مختلف ممالک کے شیروں کی شکلوں اور صورتوں میں کچھ نہ کچھ اختلافات ہیں۔ اسی طرح جو نماز مطلوب ہے وہ وہی نماز ہے جو مسلمان پڑھتے ہیں، ہر چند کہ اسکی ہئیت میں بعض جزئی اختلافات ہیں۔ جو لوگ اس طرح کی چیزوں میں زیادہ کرید و کریدی سے کام لیتے ہیں وہ اس دین قیم کے مزاج سے بالکل ناواقف ہیں جسکی تعلیم قرآن پاک نے دی ہے۔ یہ قرآن پاک ہی کی تعلیم ہے کہ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (خدا تک تمہاری قربانیوں کے گوشت اور خون نہیں پہنچ سکتے بلکہ تمہارا تقویٰ ہی اس تک پہنچ سکتا ہے)۔ پس جو لوگ اس طرح کے امور میں زیادہ کرید کرتے ہیں وہ ان یہود کے نقشِ قدم کی پیروی کرتے ہیں جنہوں نے اپنے دین میں اختلاف ڈالا اور

شبہات میں پڑے - ان لوگوں کی اصلی حالت کی تصویر قرآن نے اس جگہ کھینچی ہے جہاں ان کے گائے ذبح کرنے کا واقعہ بیان کیا ہے - پیغمبر بار بار کہہ رہا ہے کہ فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ (جو حکم دیا جا رہا ہے اسکی تعمیل کرو) لیکن وہ برابر سوال پر سوال کیے چلے جا رہے ہیں - اور اسکے بعد بھی شاید ذبح کی توفیق نہ ہوتی لیکن "ان شاء اللہ" کی برکت نے ان کو ایک عظیم فتنہ سے بچا لیا - چنانچہ قرآن نے ان کے حق میں یہ الفاظ فرمائے، وما کادوا یفعلون، اور قریب تھا کہ وہ نہ کرتے -

پس جب ایسے الفاظ مصطلحہ کا معاملہ پیش آئے جنکی پوری حد اور تصویر قرآن میں بیان نہ ہوئی ہو تو اخبار احاد پر جامد نہیں ہونا چاہیے ورنہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ شک میں پڑو گے، دوسروں کے اعمال کو غلط ٹھیراؤ گے، ان سے جھگڑو گے اور تمہارے درمیان کوئی چیز ایسی نہیں ہوگی جو اس جھگڑے کا فیصلہ کر سکے - ایسی صورتوں میں راہ عمل یہ ہے کہ جتنے حصہ پر تمام امت متفق ہے اتنے پر قناعت کرو اور جن چیزوں کے بارہ میں کوئی نص صریح اور متفق علیہ عمل ماثور موجود نہیں ہے ان میں اپنے دوسرے بھائیوں کا تخطیہ نہ کرو - جہاں تک اصطلاحات شرعیہ کا تعلق ہے، قرآن کی اس وسیع شاہراہ پر چلنا چاہیے -

باقی رہے دوسرے الفاظ اور انکے اسالیب حقیقت و مجاز تو اس باب میں ماخذ قدیم کلام عرب اور خود قرآن مجید ہے - لغت کی کتابیں اس معاملہ میں مقصر ہیں - ان میں بالعموم نہ تو الفاظ کی حد تمام معلوم ہوتی، نہ عربی خالص و مولد کے درمیان کوئی امتیاز قایم اور نہ لفظ کی جڑ ہی کا پتہ لگتا کہ معلوم ہو سکے کہ کیا اصل ہے کیا فرع، اور کیا حقیقت ہے کیا مجاز - تو جو لوگ کلام عرب کی ممارست نہیں بہم پہنچاتے، صرف لغت کی کتابوں پر قانع ہو جاتے ہیں وہ بسا اوقات قرآن مجید کے معانی سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں - پھر قدیم کلام عرب کا جتنا حصہ ہم تک پہنچا ہے اس میں بہت کچھ منحول اور شاذ کی بھی آمیزش ہے لیکن ایک ناقد ماہر کے لیے اصل و نقل میں امتیاز کرنا کچھ مشکل نہیں ہے - پس ضروری ہے

کہ صرف وہ معنی لیے جائیں جو صحیح و ثابت سے ماخوذ ہوں اور شاذ معنی ہرگز نہ لیے جائیں۔ مثلاً بعض لوگوں نے تمنی کے معنی تلاوت کے لیے لیے۔ اس طرح کے غیر ثابت اور شاذ معانی کی طرف جو لوگ گئے ہیں محض بعض اشکالات سے بچنے کے لیے گئے ہیں۔ حالانکہ یہ بجائے خود ایک بہت بڑا فتنہ اور اختلاف امت کا دروازہ ہے۔ جو شخص اصلی شاہراہ کو چھوڑ کر چلے گا اسکے لیے ناگزیر ہے کہ وہ مختلف وادیوں میں ٹھوکریں کھائے۔

اسکے علاوہ جو دوسرے علوم زبان ہیں مثلاً نحو، منطق، اصول، بیان، بلاغت، قافیہ، تو ان میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں، اپنے فوائد کی کثرت کے باوجود، فہم قرآن کے لیے کتب لغت سے بھی زیادہ مقصر ہیں۔ موجودہ فن نحو بہت اضافہ کا محتاج ہے۔ یہ صرف متوسط درجہ کے کلام کے لیے اصول فراہم کرتا ہے۔ پس مفسر کو یہ نہیں چاہیے کہ وہ کلام الٰہی کو موجودہ اصول نحو پر بہت زیادہ منطبق کرنے کی کوشش کرے۔ اس طرح کی کوشش کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کو کلام الٰہی میں ایسی ترمیم و تاویل کرنی پڑیگی جس سے ایک دیکھنے والے کو یہ گمان ہوگا کہ قرآن مجید زبان کی عام شاہراہ سے بالکل الگ ہے۔ بلکہ اسکو کلام عرب سے وہ شہادتیں فراہم کرنی چاہئیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن ہی کا اسلوب زبان کا اصلی اور اعلیٰ اسلوب ہے۔

منطق میں تمام تر مدار تحدید و نفی اور استثنا وغیرہ کے الفاظ کے استعمال میں تدقیق پر ہے۔ اس لیے "علم آدم الاسماء کلھا" اور "وما منعنا ان نرسل بالآیات الا ان کذب بھا الاولون" وغیرہ اسالیب میں جو دلیلیں پنہاں ہیں وہ اس کی گرفت سے باہر ہیں۔ ہم اس کے متعلق ایک دوسرے مقدمہ میں مفصل گفتگو کرینگے۔

علم البیان کا حال بالکل نحو کا حال ہے۔ جو کلام ایک زندہ قلب کے اندر سے اُبلتا ہے یہ علم اس سے بھی تعرض کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو آسمان وحی سے برسنے والا کلام اسکی تنگنائے

میں کیا سما سکتا ہے! صاحب وحی بلکہ ہر داعی حق کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب حالات داعی ہوتے ہیں اسکے قلب کے اندر سے ایک چشمہ اُبلتا ہے۔ وہ کبھی مجاز کے رنگ میں گفتگو کرتا ہے، کبھی حقیقت کے بھیس میں، لیکن ہر صورت میں اپنی مخاطب جماعت کی فہم اور اپنی زبان کے طریقوں کی رعایت کرتا ہے۔ وہ باپ اور بیٹے کے الفاظ استعمال کرتا ہے، اپنے جسم کو مختلف جسموں میں بانٹتا ہے، اپنا گوشت و خون دوسروں کو کھلاتا ہے، ید، ساق، وجہ، عرش، کرسی وغیرہ کلمات اپنی گفتگو میں لاتا ہے، بسط و قبض، طی و نشر، حسرت و انتقام اور غضب و محبت وغیرہ الفاظ استعمال کرتا ہے اور اس کے مخاطب ان کو بے تکلف سمجھتے ہیں۔ البتہ جو شخص علم بیان کی زنجیروں میں اپنے تئیں جکڑ لے گا وہ چیونٹی کی طرح چلیگا اور اندھوں کے مانند ٹھوکریں کھائے گا۔ زبور اور صحف انبیاء کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ آسمانی کلام میں مجاز کو کس قدر دخل ہوتا ہے۔

فن اصول کے متعلق ہم ان لوگوں کی خدمت کا اعتراف کرتے ہیں جنھوں نے اس کی بنا ڈالی۔ بے شبہ یہ فن ایک ایسا فن ہے جس کو انھوں نے یونانیوں، ہندوستانیوں یا کسی اور قوم سے نہیں لیا ہے بلکہ ضرورت داعی ہوئی کہ یہ ایسے اصول بنائیں جو کتاب و سنت سے احکام کے استنباط کے لیے ضابطہ کا کام دیں۔ پس اس فن کے یہ لوگ بانی اور اس میں دوسروں کے امام ہیں۔ لیکن اس بات کا نہایت افسوس ہے کہ بعد والوں کو اسکی تہذیب و اصلاح کی توفیق نہیں ہوئی۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا پورا نظام کمزور اور پس پسا رہ گیا اور وہ ربط و نظم اس میں نہیں پیدا ہو سکا کہ اس کو فن کا نام دیا جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں اختلافات بہت ہیں جو بالآخر احکام کے اختلاف کا سبب ہوتے ہیں۔ نحو اور منطق وغیرہ فنون کا یہ حال نہیں ہے۔ یہاں شدید ضرورت سے ہم نے یہ چند سطریں لکھی ہیں۔ اس سے زیادہ کی گنجایش نہیں ہے۔ شاید اللہ تعالیٰ مجھے اس فن کو مرتب کرنے کی توفیق بخشے۔

فن بلاغت کو لوگوں نے اشعار سے مستنبط کیا ہے اور اشعار کا دائرہ معلوم ہے کہ وہ صرف دروبست کی خوبیوں، الفاظ کی نزاکتوں اور بدیع کی صنعت کاریوں تک محدود ہے۔ باقی رہے حسنِ استدلال کے پہلو، ربط معانی کے مختلف انداز، ضرب امثال، قصص سے عبرت پذیری کے مختلف ڈھنگ، کلام کا بڑھ کر اپنے مرکز کی طرف لوٹنا، زجر اور عتاب، متکلم کی شدت یقین کا اظہار، ترفعانہ اعراض، ناصحانہ اظہار حسرت وغیرہ جنکی مثالیں صرف خطباء کے کلام اور انبیاء علیہم السلام کی وحی میں مل سکتی ہیں، ہمارے فن بلاغت نے انکو ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے۔ خطبائے عرب کا کلام ان لوگوں کو ملا نہیں، خطبائے عجم کے کلام پر انھوں نے غور نہیں کیا۔ چنانچہ باقلانیؒ نے باوجودیکہ بلاغت قرآن کو بے نقاب کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر ڈالا ہے لیکن استناد کے لیے تمام تر اشعار پر اعتماد کیا ہے۔ خطبات کے صرف تھوڑے سے نمونے دیے ہیں تاکہ مقابلہ کر کے تم خود کچھ فرق معلوم کرلو۔ باقی وہ دس امور، جنکا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، جن میں سے پانچ عقلی ہیں، پانچ نفسی، تو ان کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ یہ امور ایسے نہیں ہیں جو کسی ایک زبان کے ساتھ مخصوص ہوں بلکہ تمام زبانوں میں عام ہیں اس لیے کلام سے ان پر شہادتیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف اشارہ کر دینا کافی ہے۔ قرآن مجید خود ان کے اوپر دلیل ہے۔

پھر موجودہ علم بلاغت اسالیب کلام کی معرفت کے لیے بھی کوئی قیمتی رہنمائی اپنے اندر نہیں رکھتا۔ اس فن کے مصنفین عموماً عجمی ہیں اور اہل عجم کیلیے عرب کے انداز و اسالیب پر غور کرنا اور ان کو سمجھنا نہایت مشکل ہے۔ پس بجائے اسکے کہ انکی کوتاہیوں اور نارسائیوں کی شکایت کی جائے، جو تھوڑی بہت خدمت انھوں نے اس فن کی کی ہے اس پر ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ یہ کیا کم ہے کہ بعض جگہ ان کا تیر نشانہ پر لگا ہے اور بعض جگہ اگر نشانہ پر نہیں لگا ہے تو اسکے قریب پہنچا ہے۔ اپنا مقصد واضح کرنے کے لیے میں ایک علیحدہ مقدمہ میں بعض ایسے اسالیب کا ذکر

کروں گا جو عربی زبان کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اسی طرح قوانی قرآن اور اس کے کلمات کے انسجام کے متعلق بھی علحدہ گفتگو کروں گا۔[1]

مقدمہ (۴)

کتب منزلہ کی شرح ایک دوسرے کی مدد سے

یہاں میرا مقصد صرف اس شرح و توضیح سے ہے جس کا تعلق زبان اور اسالیب بیان سے ہے باقی احکام و اخبار کے متعلق ایک دوسرے مقدمہ میں گفتگو کروں گا۔

یہ معلوم ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا کلام جسکی روایت یونانی زبان میں ہوئی، دراصل عبرانی میں تھا۔ انجیل اور توریت کی زبان ایک ہی ہے۔ اور یہ امر بھی ہر شخص کو معلوم ہے کہ عربی اور عبرانی جو کتب منزلہ کی زبان ہیں، دونوں ایک ہی اصل سے نکلی ہیں۔ ایسی صورت میں ناگزیر ہے کہ ان دونوں میں نہایت گہری مماثلت و مشابہت ہو اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کے معانی کی طرف رہبری کرے۔ پھر ان تمام صحیفوں کے مطالب بھی ایک سے ہیں۔ یہ سب وحی کے پاک سرچشمے سے نکلی ہیں اس لیے بھی ان میں یکسانی و ہمرنگی قدرتی ہے۔ علاوہ ازیں قرآن نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ جو امور اہل کتاب پر مشتبہ رہگئے، قرآن ہمارے لیے انکی تفصیل کرے گا۔ پس ان امور کا جاننا بھی فائدہ سے خالی نہیں۔ نیز قرآن مجید کتب منزلہ کا مصدق ہے تو ان کی باہمی موافقت اور سازگاری ازدیاد ایمان و طمانیت کا باعث ہوگی۔ پھر قرآن مجید جھگڑے کو چکانے والی اور اختلافات کو رفع کرنے والی کتاب بنکر نازل ہوا ہے اور اسکے ماسوا اکثر کتب منزلہ تخیل و شعر ہیں لہٰذا جو لوگ ان کتابوں کو سمجھنا چاہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ ان کو قرآن کی روشنی میں سمجھیں۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ یہ پرانے صحیفے متروک ہو چکے ہیں اس وجہ سے ان کی زبان مٹ چکی ہے۔ اب

[1] ان مسائل پر تفصیلی بحث اس مقدمہ کے بجائے مولانا نے جمہرہ میں کی ہے۔ اسکو دیکھنا چاہیے (مترجم)

اگر کوئی شخص ان کو سمجھنا چاہے تو اسکے لیے صرف ایک ہی شکل ہے کہ انہیں لغت قرآن کی رہنمائی سے سمجھے - ان باتوں کی طرف میرا ذہن اس لیے گیا کہ میں جانتا ہوں، انجیل اور توریت کی بہت سی باتیں، ان کے ماننے والوں کے لیے فتنہ بنگئیں - حالانکہ اگر وہ عربی زبان جانتے ہوتے تو اس گمراہی میں نہ پڑتے - حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ آدمی لفظوں سے ہلاک ہوتا ہے اور معانی سے نجات پاتا ہے - یہ لوگ الفاظ پر جم گئے اس لیے ان پر ہدایت کی راہ باز نہ ہوئی - اسی سے ملتا جلتا حال مسلمانوں کا ہے - بعض مسلمان انجیل کی بعض عبارتوں کا مذاق اڑاتے ہیں حالانکہ اگر وہ قرآن کی تعلیم سے انکو مطابقت دے سکیں تو انکو معلوم ہو کہ ان باتوں کے ماننے کی سب سے بڑی ذمہ داری مسلمانوں ہی پر ہے - قرآن میں ہم کو متشابہات پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے ہم کوئی وجہ نہیں دیکھتے کہ آخر یہ حکم دوسری آسمانی کتب کے متعلق بھی کیوں نہ ہو - قرآن مجید میں صاف ہے کہ اگر ایک شخص ایک بات کی تاویل نہ جاننے کی وجہ سے اس کا انکار کردے تو وہ سخت گنہگار ہے - بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ - (بلکہ انھوں نے اس چیز کا انکار کیا جو انکے علم کے دائرہ میں نہ سما سکی اور جسکی حقیقت ان کے سامنے ابھی نمودار نہیں ہوئی - ایسے ہی ان لوگوں نے انکار کیا جو ان سے پہلے تھے تو دیکھو ظالموں کا انجام کیا ہوا) - اسی کے مطابق پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے - آپ نے فرمایا لا تصدقوا اھل الکتاب اہل کتاب کی تصدیق نہ کرو (یعنی جو کچھ کتب متقدمہ سے روایت کریں اسکی تصدیق نہ کرو کیونکہ انھوں نے انکو محفوظ نہیں رکھا) ولا تکذبوھم اور نہ انکی تکذیب کرو (کیونکہ ممکن ہے وہ اُن باتوں میں سے ہو جسکی حقیقت ابھی ہمارے سامنے نہیں آئی ہے)۔

اگر تم کو شبہ ہو کہ کتب مقدسہ غیر محفوظ ہیں اس وجہ سے اگر قرآن کی تاویل میں ہم اُن سے

رجوع کرینگے تو غلطی میں پڑنے کا امکان ہے، تو یہ شبہ بالکل بجا ہے۔ لیکن ہم یہ نہیں کہتے ہمارا کہنا یہ ہے کہ پہلے قرآن کو خود قرآن اور لغت عرب کی مدد سے سمجھنا چاہیے پھر اگر کتب مقدسہ میں کوئی ایسی بات ملے جو معنی اور اسلوب کے اعتبار سے اس سے اقرب ہو یا اس سے واضح تعلق رکھتی ہو تو دونوں باتوں پر تدبر اور ان کے اسلوبوں کے تقابل سے قرآن مجید کی بلاغت واضح ہوگی، نیز مختلف معانی میں سے ہم جس مفہوم کو مرجح قرار دینگے اس تائید مزید سے اس پر اعتماد محکم ہوگا۔ علاوہ بریں وحی قدیم کی بعض ایسی باتوں کا مفہوم واضح ہو جائیگا جس کا واضح ہونا بظاہر محال نظر آتا تھا۔ یہ چیز اہل کتاب کے ارباب نظر کے لیے قرآن کی صداقت کی اور ہمارے لیے انکی کتابوں کی صداقت کی ایک دلیل ہوگی جس سے باہمی محبت کی راہیں کھلینگی اور یہ چیز ان کی ہدایت کے لیے بھی راہ ہموار کرے گی۔ لیکن اسکے برعکس، تم دیکھتے ہو کہ بعض مسلمان انجیل کی آیتوں کا مذاق اڑاتے ہیں اور جو لوگ حضرت مسیح علیہ الصلوۃ والتسلیم کا مذاق اڑائیں ان کی شکایت اللہ تعالیٰ کے سوا اور کس سے کی جاسکتی ہے! مسلمانوں کو یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ ان کو صرف خوب صورت انداز سے مباحثہ کی اجازت دی گئی ہے اور مخالف فریق کو برا بھلا کہنے سے نہایت سختی کے ساتھ روکا گیا ہے۔ اس چیز کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوا کہ ہم سے ان کی دوری بڑھتی گئی اور خلیج اختلاف وسیع تر ہوتی چلی گئی اور پھر لازمی نتیجہ کے طور پر قبول حق سے بھی وہ محروم رہے۔ حالانکہ اگر یہ سچ ہے کہ حق باطل پر غالب رہتا ہے اور روشنی تاریکی کو مٹا دیتی ہے تو ہمارے اور ان کے درمیان اس سے بڑھکر کوئی حجت نہیں ہوسکتی کہ ہم دونوں چیزوں کو ایک ساتھ برابر برابر رکھدیں کہ جسکے اندر عقل اور مذاق سلیم موجود ہے وہ ان میں سے بہتر کو منتخب کرلے۔ قرآن مجید نے ہدایت پانے والوں کی تعریف یہی کی ہے۔ اَلَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ (جو لوگ بات سنتے ہیں اور پھر اس میں جو بہتر ہوتی ہے اسکی پیروی کرتے ہیں)۔

یہ وجوہ داعی ہوئے کہ عہد جدید اور عہد عتیق میں جو کچھ ہے میں اس کی بھی جستجو کروں۔ میری نیت نیک ہے۔ اور میرا اعتماد اللہ تعالیٰ پر ہے۔ اس سے التجا ہے کہ وہ خیر کی راہوں میں میری رہنمائی فرمائے۔

ایک مستقل مقدمہ میں میں اُن باتوں کا ذکر کرونگا جو نصاریٰ کی گمراہی کا باعث ہوئیں اور جن پر ان کے موجودہ دین کی تمام عمارت قائم ہے۔ مثلاً ابن اور اب کے الفاظ، روٹی اور شراب کا حضرت عیسیٰؑ کا گوشت اور خون ہوجانا۔ یہ بات کہ وہ خدا وند کے داھنی جانب بیٹھے ہیں، فرشتوں کی فوج میں اُترینگے اور قیامت کے دن عدالت کرینگے، یہ بات کہ وہ فارقلیط کو بھیجینگے جو ان کو تمام تفصیلات شریعت کی تعلیم دیگا، نیز یہ امر کہ ان کے زمانہ کے لوگ اُن تمام باتوں کو دیکھینگے جن سے انھوں نے ڈرایا ہے، ان تمام امور کی حقیقت الفاظ کے معانی کی تحقیق سے واضح ہوجائے گی جیسا کہ آگے مذکور ہوگا۔

مقدمہ (۵)

قرآن قطعی الدلالۃ ہے

قرآن مجید بالکل قطعی الدلالۃ ہے۔ مختلف معانی کا احتمال محض قلت علم و تدبر کا نتیجہ ہے۔ جن علماء نے اپنی تفسیروں میں بہت سے اقوال نقل کر دیے ہیں، ان کا منشا یہ ہے کہ آیت کی تاویل میں جو کچھ کہا گیا ہے اسکو ہمارے سامنے رکھدیں۔ اس میں سے قول راجح کا انتخاب انھوں نے ہماری تمیز پر چھوڑا ہے۔ پس یہ بات جائز نہیں ہے کہ ہم بغیر کسی ترجیح و انتخاب کے تمام رطب و یابس یاد کرلیں۔ اور پھر حیرانی و سرگشتگی کی وادیوں میں ٹھوکریں کھاتے پھریں۔ مثال کے طور پر امام رازی رحمہ اللہ کی تفسیر میں بقرہ کی آیت ۱۹۱ کے ماتحت لفظ فتنہ کے معنی دیکھو۔ انھوں نے اس کے

[1] اس عنوان پر مولانا نے الاکلیل فی شرح الانجیل کے نام سے مستقل رسالہ لکھنا شروع کیا تھا۔ اس مقدمہ میں اسکی مزید شرح نہ فرما سکے۔ (مترجم)

پانچ معانی بتائے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب صحیح نہیں ہیں۔ پس میں نے اپنی کتاب میں صرف وہی اقوال نقل کیے ہیں جو میری تحقیق پر صحیح اُترے ہیں۔ اور یہی ہمارے اسلاف کا طریقہ تھا۔ اقوال کی کثرت تو ایک طالب کو بالکل حیران و درماندہ کر دیتی ہے۔ بسا اوقات لوگ مجرد اقوال نقل کر دیتے ہیں، ان کے دلائل بیان نہیں کرتے۔ یہ ان اقوال کے کہنے والوں اور ان کے سننے والوں دونوں پر نہایت کھلا ہوا ظلم ہے۔ میں نے آیات کے معانی تفسیر کی کتابوں سے نہیں لیے ہیں بلکہ خود آیات پر ان کے سیاق و سباق اور انکی مماثل آیات کی روشنی میں غور کیا ہے۔ اس طرح جب چند آیتوں کے معنی روشن ہو گئے تب میں نے تفسیر رازی یا طبری اٹھائی۔ ان میں کبھی تو ایسا ہوا کہ کوئی قول سلف کا میرے موافق مل گیا، کبھی میں سلف کے قول کے بالکل قریب قریب پہنچ گیا اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ جو معنی میری سمجھ میں آئے تھے اُن سے مجھے رجوع کرنا پڑا۔ اور ایسا بھی بارہا ہوا کہ کوئی مشکل ایسی پیش آگئی کہ اس کے لیے مجھے عرصہ تک توقف کرنا پڑا۔ لیکن ہر حال میں اشکال و ابہام کو میں نے اپنے علم و فہم کی کوتاہی اور غلط رایوں کی عامیانہ تقلید ہی پر محمول کیا۔

اگر تم کو اس بات پر تعجب ہو کہ ایک بالکل کھلی ہوئی اور واضح چیز میں ابہام و اشکال کا کیا ذکر! تو اسکے معنی یہ ہیں کہ اس کثافت پر تمہاری نظر نہیں ہے جسکی تہوں پر تہیں ہمارے اوپر اڑھا دی گئی ہیں۔ کتنے کھلے ہوئے حقائق ہیں جن میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے لیکن جن طبیعتوں پر تاریکی چھائی ہوئی ہے وہ ان کے دیدار سے محروم ہیں۔ وجود باری میں، اسکی واحدانیت و یکتائی میں، روح کی جسم پر حکومت میں، روزِ جزا میں، ایک صاحب بصیرت کے لیے کہاں شک کی گنجائش ہے؟ لیکن دیکھتے ہو کہ ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو وجود باری اور توحید باری وغیرہ جیسے حقائق میں بھی شک کرتے ہیں، پھر دوسرے مسائل کا کیا ذکر! یہ بات بھولنی نہیں چاہیے کہ جس طرح حواس کو بیماریاں لاحق ہوتی ہیں اسی طرح عقل کی بھی بیماریاں ہیں اور جب وہ بیماریاں اس کو لاحق ہو جاتی ہیں

تو واضح سے واضح حقیقت بھی اسکی سمجھ میں نہیں آتی - کیونکہ باتیں عقل و حواس کی تندرستی کے لحاظ سے کہی جاتی ہیں تو جو عقل مبتلائے امراض ہوگی وہ ان کو کیسے سمجھ سکتی ہے ! سورج چمک رہا ہے، شکر میٹھی اور سفید ہے، ایک سلیم الحواس انسان ان باتوں میں ایک لمحہ کے لیے بھی شک نہیں کریگا لیکن کیا ایک اندھے، ایک احول اور ایک تپ زدہ کا بھی یہی حال ہوگا؟ اللہ تعالیٰ نے اس کی تصریح فرمائی ہے کہ قبول رشد و ہدایت میں سب کا حال یکساں نہیں ہو سکتا - قرآن شریف کی نسبت فرمایا ہے - ھدی للمتقین - پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہے - دوسری جگہ فرمایا ہے - وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا (جب تم قرآن سناتے ہو ہم تمہارے درمیان اور ان لوگوں کے درمیاں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ایک کثیف پردہ ڈال دیتے ہیں)-

سقراط کا قول مشہور ہے کہ نفس کو تمام حقائق معلوم ہیں لیکن اس پر نسیان طاری ہے - روحی کا مقولہ ہے کہ اپنے نفس کی تاویل کرو، قرآن کی تاویل نہ کرو - خواجہ حافظ کا ارشاد ہے کہ سب سے بڑا حجاب تمہارا نفس ہے، اسکو دور کرو - ان باتوں کا کیا مطلب ہے؟ بہرحال ہمارا عقیدہ یہی ہے کہ قرآن نے ادائے مطلب کے لیے وہی اسلوب اختیار کیے ہیں جو سب سے زیادہ واضح، سب سے زیادہ اقرب اور سب سے زیادہ خوبصورت تھے - اور جہاں کہیں کسی اسلوب میں کوئی تصرف کیا ہے تو کسی اہم فائدہ کے لیے کیا ہے - ہم ایک علحدہ مقدمہ میں اس پر بحث کرینگے اور وہاں تاویل کے وہ اصول بیان کرینگے جو مختلف اقوال کے احتمال کا سدباب کر دینگے[1] - آیات متشابہات اور حروف مقطعات کے باب میں بھی ہمارا یہی مذہب ہے - وہ اپنی دلالت میں زیادہ سے زیادہ واضح ہیں - ہم ایک مستقل مقدمہ میں ان پر بھی گفتگو کرینگے -

[1] اصول تاویل پر مولانا مرحوم کا ایک مستقل رسالہ ہے - اب تک اسکی اشاعت کی نوبت نہیں آئی - لیکن شاید جلد چھپ جائے (مترجم)

مقدمہ (۶)

مناسبت و ترتیب

جس طرح ایک سپہ سالار اپنی افواج کو مختلف ڈھنگ سے ترتیب دیتا ہے، اور اسکی تدبیروں اور مصلحتوں کو صرف ماہرین فن ہی سمجھ سکتے ہیں، عوام صرف فتح و غلبہ سے اسکی مہارتِ فن کا اندازہ کرسکتے ہیں، اسی طرح قرآن مجید میں ایک ہی بات مختلف طریقوں سے کہی جاتی ہے اور صرف ماہرین بلاغت ہی اسکے اسرار و نکات کو سمجھ سکتے ہیں۔ ہمارے بعض مفسرین کے نزدیک اس کا مقصد قرآن کے اعجاز کو ظاہر کرنا ہوتا ہے۔ لیکن میرے نزدیک اعجاز، قرآن کے اغراض و مقاصد میں سے نہیں ہے، اسکے لوازم میں سے ہے۔ اس کائنات کے اندر ایک چھوٹے سے دانے بلکہ ایک حقیر سے ذرے سے لیکر اس گنبد گرداں تک جو کچھ ہے سب معجزہ ہی معجزہ ہے لیکن ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی چیز کی خلقت بھی اظہار اعجاز کے لیے نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے لیے ہے۔ یہ اور بات ہے کہ دوسرے ان کو بنانے سے عاجز ہیں اس لیے ثابت ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی ہیں۔

قرآن میں ایک ہی چیز کبھی عمود کی حیثیت سے آتی ہے، کبھی ضمنی مضمون کی حیثیت سے کبھی وہی چیز اجمال کے ساتھ آتی ہے، کبھی تفصیل کے ساتھ۔ کبھی ایک چیز موخر ہوتی ہے کبھی مقدم کبھی تنہا ہوتی ہے کبھی اپنے مقابل کے ساتھ۔ کبھی کسی چیز کے ساتھ اسکا جوڑ ہوتا ہے کبھی کسی چیز کے ساتھ۔ بالکل یکساں مضمون مختلف سورتوں میں مختلف ترتیبوں کے ساتھ سامنے آتے ہیں اور ظاہر ہے کہ جب ایک ہی شے اپنے مختلف پہلوؤں سے تمہارے سامنے جلوہ گر ہوگی تو اس کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لینے اور پوری طرح پہچان لینے میں تمہیں کوئی دقت نہیں ہوگی۔ اگر ایک ادا سے نگاہ چوک گئی، دوسرا جلوہ سامنے آجائیگا۔ قرآن مجید کی اسی صفت کو ان لفظوں میں بیان کیا گیا

ہے - کذلک نصرف الآیات لعلہم یفقہون - "اسی طرح ہم پھیر پھیر کر اپنی آیتیں بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھیں"۔

اور ہر تالیف میں ایک خاص حکمت ملحوظ ہوتی ہے - ہم بالاجمال تالیف کے مختلف طریقوں کی طرف یہاں اشارہ کرنا چاہتے ہیں اور اوپر جن پانچ امور کا ذکر کیا ہے ان میں سے بعض پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں -

سب سے پہلے عمود پر غور کرو - عمود ہر سورہ کا ایک ہوتا ہے لیکن یہی ایک بسا اوقات بہت سی چیزوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے - مثلاً سورہ حجرات کے عمود کو لو - ہے یہ ایک ہی بات - گو لغت میں ہم اس کے لیے ایک ہی جامع لفظ نہ پا سکیں - تعبیر مطلب کے لیے یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس سورہ میں بدخلقی پر توبیخ ہے، عام اس سے کہ وہ بدخلقی خیال سے تعلق رکھتی ہو، یا قول سے، یا عمل سے - چنانچہ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے گفتگو میں سبقت، آپ کی آواز پر آواز بلند کرنے، عام آدمیوں کی طرح آپ کو پکارنے، بے ضرورت اور بے موقع آپ کو زحمت دینے اور کسی فاسق کی اطلاع پر کسی قوم پر ٹوٹ پڑنے کی ممانعت کی گئی ہے - پھر مسلمانوں کی دو جماعتوں میں اصلاح، ظالم کے خلاف مظلوم کی حمایت، اور ان کے درمیان عدل کا حکم دیا گیا ہے - اس کے بعد لوگوں کے ساتھ تمسخر سے، عیب جوئی سے، تنابز بالالقاب سے، بدگمانی سے، تجسس سے، غیبت سے، غرور نسب سے، ادعائے پارسائی سے اور پھر سب سے آخر میں، سب سے بدترین شے، یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنے اسلام کا احسان دھرنے سے روکا گیا ہے - یہ ایک مثال میں نے اس لیے پیش کی ہے کہ تم وحدت میں کثرت کا جلوہ دیکھ سکو - اسکے حسن نظام پر مفصل بحث اپنے مقام پر ملے گی -

عمود کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ سورہ کے اندر اپنی حقیقت کے اعتبار سے سب سے عظیم الشان بات ہو - اس کے لیے عظیم الشان بات نہیں بلکہ سب سے زیادہ جامع بات ہونا ضروری ہے - کیونکہ وہ

سورہ کے تمام مطالب کے لیے شیرازہ ہے - ہاں بیان کے لحاظ سے وہ سورہ کے اندر سب سے زیادہ اہم چیز ہوگی - سورہ نور کے اندر، آیت نور کس طرح آفتاب تابان بنکر چمک رہی ہے، لیکن اسکے باوجود وہ سورہ کے اندر بالکل ضمنی چیز ہے - عمود کی حیثیت سے نہیں ہے - عمود اس کا عورتوں سے متعلق حسن ادب کی تعلیم ہے - اسی وجہ سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ یہ سورہ عورتوں کو پڑھائی جائے تاکہ وہ اپنے حقوق اور ذمہ داریوں کو معلوم کر سکیں -

یہ تو کسی چیز کے بطور عمود آنے کی شکل تھی - ضمناً آنے کی صورت یہ ہے کہ کوئی چیز بطور دلیل یا مثال آجائے - یا بعد میں آنیوالے دعوی کے لیے کسی مثال یا حجت سے تمہید استوار کی جائے یا ماسبق کی توسیع یا تحدید کی جائے - یا کوئی سوال پیدا ہوتا ہو اسکا جواب دیا جائے - یا اپنے مابعد کی تمہید ہو، یا کوئی مناسب مقام حکمت برسبیل ذکر آجائے، یا ماسبق کی تفصیل ہو، یا وعد و وعید اور مدح و ذم کے ذریعہ سے تحریض ہو، یا کسی مزید علم کا بیان ہو، یا موقع کی مناسبت سے حمد الٰہی اور صفات رب کا بیان ہو اور یہی چیز قرآن حکیم کی روح ہے -

اب ہم مختصراً اوپر کی باتوں میں سے پانچویں بات کی کسی قدر وضاحت کرنا چاہتے ہیں یعنی اس امر کی کہ کس طرح ایک شے کبھی ایک چیز کے ساتھ ملائی جاتی ہے اور کبھی دوسری شے کے ساتھ - اگر تم اس بات کا یقین رکھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں نہایت اعلیٰ حکمت مدنظر رکھی ہے تو جب تم ایک شے کو کسی شے کے ساتھ دیکھو گے تو ضرور ان دونوں کے درمیان مناسبت تلاش کرو گے یہ تلاش ایسے مخفی دقائق حکمت تک تمہاری رہبری کریگی جن دقائق تک وہ شخص کبھی نہیں پہنچ سکتا جو تدبر کا عادی نہیں ہے - ایک ہی شے کے مختلف پہلو ہوتے ہیں، ایک پہلو سے وہ کسی چیز سے مناسبت رکھتی ہے اور دوسرے پہلو سے کسی چیز سے - مثلاً دیکھو نماز اور حج میں کتنی مناسبتیں موجود ہیں - دونوں ذکر الٰہی کی صورتیں ہیں، دونوں بدنی عبادتیں ہیں، دونوں بیت اللہ سے تعلق رکھتی ہیں، نیز نبی

صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ طواف نماز ہے۔ نماز میں اتنی مناسبتیں حج کے ساتھ تھیں۔ اب روزہ کے ساتھ نماز کی مناسبتوں پر غور کرو۔ دونوں کسی مخصوص جگہ کی قید سے آزاد ہیں، دونوں کی بنیاد صبر پر ہے یہاں تک کہ پہلے ادیان میں سکوت بھی روزہ کے شرائط میں شامل تھا، اس اعتبار سے گویا نماز نفس کا باطنی روزہ ہے۔ پھر نماز کی مناسبت زکوٰۃ کے ساتھ دیکھو۔ یہ دونوں متقابل ہیں دونوں ایک دوسرے سے کمال کو پہنچتی ہیں۔ دونوں ایک ہی جڑ سے پھوٹی ہیں۔ نماز کی حقیقت بندہ کا خدا کی طرف محبت اور خشیت سے مائل ہونا ہے اور زکوٰۃ کی حقیقت بندہ کا بندہ کی طرف محبت اور شفقت سے مائل ہونا ہے۔ پس کمال سعادت کے لیے دونوں لازمی ہیں اور ان دونوں کی روح محبت ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ خود دین کی حقیقت بھی محبت، گداز باطنی اور لطافت احساس ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام صفات میں رحم کو مقدم کیا اور فرمایا کہ وسعت رحمتی کل شئ، میری رحمت ہر چیز کو حاوی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ دین کی اصل حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا عکس اسکے بندوں میں نظر آئے اور اسی چیز کی وجہ سے انسان خدا کی خلافت کی عزت سے سرفراز ہوا۔ پس نماز کی مناسبتوں پر غور کرنے سے ہم کو دین کی اصل اور تمام شرائع کی روح کا سراغ لگ گیا۔ یہی حقیقت تورات و انجیل سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ (مزید تفصیل کے لیے دیکھو مقدمہ ۱۰)

ایک اور ذرا دقیق مثال لو۔ سورہ عقود میں اللہ تعالیٰ نے پہلے کھانے کی چیزوں میں سے جو چیزیں جائز ہیں انکو بیان کیا، پھر جن عورتوں سے نکاح جائز ہے انکو بیان کیا، پھر وضو کا ذکر فرمایا اب ان کی مناسبت پر غور کروگے تو دو چیزیں تمہارے سامنے آئینگی۔ ایک شئ اور ایک شرط شئ۔ شرائط میں سے وہ چیزیں بیان کیں جن سے یہ چیزیں پاک ہوتی ہیں۔ اب دیکھو ذبح چوپایوں کو پاک کرتا ہے، مہر اور احصان سے عورتیں پاک ہوتی ہیں اور وضو نماز کی پاکی ہے۔ پھر تمام حقیقت کو آخر میں یہ فرما کر کھول دیا ما یرید اللہ لیجعل علیکم من حرج ولکن یرید لیطھرکم ولیتم

نعمتہٗ علیکم۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی تنگی ڈالے بلکہ چاہتا ہے کہ تم کو پاک کرے اور تم پر اپنی نعمت تمام کرے۔ یہ شرائط کا بیان تھا۔ اب اشیاء پر غور کرو گے تو معلوم ہوگا کہ یہاں تین چیزیں بیان کی گئیں: طیباتِ طعام، طیباتِ نساء، طیبات نماز۔ اگر اس سے زیادہ تعمق کی نگاہ سے دیکھو گے تو معلوم ہوگا کہ یہ دنیا عالم کون و فساد ہے، پس یہاں تین عوالم: عالم شخص، عالم نوع اور عالم روح کے نقص کی تلافی تین چیزوں:۔ طعام۔ نکاح۔ اور نماز سے فرمائی پھر طعام اور نکاح میں ایک اور مناسبت بھی ہے کہ دونوں میں سے جو چیزیں حرمت کا محل ہیں ان کی تخصیص کر دی گئی چنانچہ دیکھو دونوں آیتیں بالکل ایک ہی نہج پر وارد ہوئیں۔ حرمت علیکم امھاتکم و بناتکم الآیہ حرمت علیکم المیتۃ والدم الآیہ۔ اسی طرح نماز اور نکاح میں مناسبت کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ نکاح بدکاری کی آلودگیوں سے حفاظت کرتا ہے اور نماز فحشاء اور منکر سے روکتی ہے ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر۔ یہ مناسبت دونوں میں پاکیزگی کے پہلو سے تھی۔ بقرہ میں تخفیف کے پہلو سے ان کی مناسبت دیکھو۔ فرمایا حافظوا علی الصلوات .... فان خفتم فرجالا او رکبانا۔ یہی صورت حال نکاح میں ہے۔ نکاح کی حفاظت حتی الامکان واجب ہے مگر طلاق کے وقت اس میں کسی قدر تخفیف کی گئی۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید میں ہر تالیف اپنے اندر ایک نیا جلوۂ حسن و جمال رکھتی ہے۔

مقدمہ (۷)

ہر سورہ میں ایک مخصوص نظام ہے

اس مقدمہ میں ہم یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ہر سورہ میں ایک مخصوص نظام ہے اور اقتضاب، جو بظاہر نظر آتا ہے، محض قلت تدبر کا نتیجہ ہے۔ یہ بات ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ قرآن کی سورتیں چھوٹی بھی ہیں اور بڑی بھی۔ پس اگر ہر سورہ میں کوئی ایک مقصد و منہج نہ ہوتا، جسکے پورے ہونے سے سورہ

پوری ہوتی ہے، تو یہ الگ الگ حد بندیوں کی کیا ضرورت تھی؟ سارے قرآن کو ایک سورہ بنا دیا جاتا۔ نیز جب سورتوں کے لیے کوئی خاص مقدار نہیں ٹھیرائی گئی، بڑی چھوٹی ہر طرح کی سورتیں ہوئیں، تو اگر ہر سورہ کے اندر کوئی نظمی وحدت مدنظر نہیں ہے تو آیتوں کو ایک لڑی میں پرونے کی کیا ضرورت تھی؟ اجزاء یوں ہی بکھیر دیے جاتے۔ اور اگر سطر سطر کے برابر کے اجزاء ہوتے جب بھی کوئی مضائقہ نہ ہوتا۔

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ آیات کا ایک مجموعہ ایک سورہ کے اندر رکھا گیا اور وہ سورہ کے نام سے موسوم ہوا۔ گویا ایک شہر بسا کر اسکے اردگرد شہر پناہ کھینچ دی گئی۔ تو اب غور کرنے کی بات ہے کہ ایک شہر پناہ کے اندر کئی شہر کیسے جمع ہو سکتے ہیں! یہ بھی واضح ہے کہ معانی کا تشابہ بھی انکو ایک شہر پناہ کے اندر نہیں جمع کرتا۔ معوذتین باہمد گر جسقدر مشابہت رکھتی ہیں، معلوم ہے تاہم دو مستقل سورتیں قرار پائیں۔ اسی طرح سورۂ تکویر، انشقاق، مرسلات، نازعات، ذاریات سب متحد المعنی سورتیں ہیں لیکن نظم اور اسلوب کلام ان میں مختلف ہیں۔

یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ جب قریش قرآن کے مانند دس سورتیں لانے سے عاجز رہے تو ایک سورہ کے لیے تحدّی ہوئی۔ اس سے کم کے لیے تحدی نہیں ہوئی۔ اور سورتیں چھوٹی بڑی ہر قسم کی مراد ہیں۔ لیکن اس سے ایک سورہ کے بقدر کلام مراد نہیں ہے۔ ہمارے بعض مفسرین کو یہی غلط فہمی ہوئی چنانچہ انکو کلام کی اتنی مقدار میں وجہ اعجاز تلاش کرنے میں زحمتیں پیش آئیں مثلاً آیت حرمت علیکم امہاتکم وبناتکم سورہ کوثر سے مقدار میں زیادہ ہے لیکن اس سوال میں انکو حیرانی پیش آئی کہ اس میں وجہ اعجاز کیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ تحدی میں مقصود ایک سورہ بحیثیت مجموعی ہے۔ بلاشبہ ایک سورہ کے مانند لانا تمام جن و بشر کی طاقت سے باہر ہے۔ اگرچہ سورہ کوثر کی سی مختصر ہی سورہ کیوں نہ ہو۔ اس سے غالب گمان یہ ہوتا ہے کہ سورہ سے اللہ تعالیٰ

کی مراد ایک منظم کلام ہے۔ اس میں چھوٹی بڑی کا امتیاز نہیں ہے۔ جس طرح درخت، نبات حیوان کے الفاظ ہیں جو اپنے ماتحت اپنے تمام چھوٹے بڑے اجزاء پر مشتمل ہیں اسی طرح سورہ کا لفظ طوال و قصار سب پر مشتمل ہے۔ بعض علماء کے اقوال سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ امام سیوطیؒ نے اتقان میں جعبری کا ایک قول نقل کیا ہے۔

"سورہ کی حد قرآن کی اتنی مقدار ہے جو چند آیات پر مشتمل ہو جن میں تمہید اور خاتمہ ہو اور اسکی کم سے کم مقدار تین آیت ہے۔"

اس محقق کے نزدیک سورہ کے لیے ایک ایسی نظمی وحدت ضروری ہے جس میں تمہید، خاتمہ اور عمود ہو اس لیے کم از کم تین آیتیں سورہ کی تالیف کے لیے ضروری ہوئیں۔

مزید برآں اگر تم چھوٹی سورتوں پر تدبر کرو تو معلوم ہوگا کہ ربط و نظام کے محاسن کے لحاظ سے وہ بڑی سورتوں کی ہمسر ہیں۔ کیونکہ چھوٹی آیتوں کے اندر بھی ربط و پیوستگی کی وہ تمام نزاکتیں موجود ہیں جو بڑی آیتوں کے اندر ہیں۔ اس لیے یہ خیال کرنا کہ چھوٹی سورتوں مثلاً ماعون، کوثر اور عصر وغیرہ میں بے نظمی ہے سخت غلطی ہے۔ ان سورتوں کا باریک نہج اگر تمہاری سمجھ میں آجائے تو طوال کا نہج سمجھنے میں اس سے تمہیں بڑی مدد ملیگی۔ اسی طرح طوال کے اندر آیتوں کے ایسے مجموعے ہیں جنکا نظم و ربط بالکل واضح ہے صرف ایک غبی آدمی ہی انکے سمجھنے سے قاصر رہ سکتا ہے مثلاً سورہ بقرہ کی ابتدائی بیس آیتیں۔ پس جو شخص ان میں تفکر کرے اس میں آہستہ آہستہ اُن سے زیادہ دقیق نظام سمجھنے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے۔ قرآن کے تفکر میں میرا یہی حال ہوا۔ اور میں یقین رکھتا ہوں کہ جو لوگ جستجو کی یہ راہ اختیار کرینگے وہ بالآخر نظم کو پالینگے۔ والذین اھتدوا زادھم ھدیٰ۔

مقدمہ (۸)

احکام و حقائق کے باب میں قرآن اور کتب سابقہ کا تعلق

سورج کے طلوع ہو جانے کے بعد تاروں کی روشنی کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ اسی طرح

قرآن کے نزول کے بعد مسلمان اُن پچھلے صحیفوں سے بالکل بے نیاز ہو گئے جن میں جھوٹی اور سچی ہر قسم کی باتیں مل گئی تھیں۔ تاہم قرآن مجید آسمانی صحیفوں میں سے ایک ہے اور ہمارے نبی کریم محمد رسول اللہ صلعم جماعت انبیاء کے ایک فرد ہیں۔ اور تمام مسلمان انبیاء کی کثرت کے باوجود، ایک ہی امت ہیں۔ اس وجہ سے ہمارے لیے پچھلے صحیفوں کی تعلیمات کو جاننا ضروری ہے۔ اس سے گوناگوں فوائد حاصل ہونگے۔ اس سے قرآن عظیم کی قدر و عظمت معلوم ہوگی اور ہم اللہ تعالیٰ کی اس عظیم نعمت پر اسکے شکر کی توفیق پائینگے۔ اس سے قرآن مجید کی وہ تلمیحات واضح ہونگی جو ہمارے متاخرین مفسرین سے مخفی رہ گئیں اور وہ ایک سے زیادہ مقامات میں اصل حقیقت تک پہنچنے سے قاصر رہ گئے نیز اس سے اہل کتاب پر حجت کے دلائل ہاتھ آئینگے جو بجائے خود ایک بڑا فائدہ ہے۔

قرآن مجید، اگلے صحیفوں کے بعد، دو خاص مقصدوں سے نازل ہوا ہے۔

۱۔ دین کا جو حصہ باقی رہ گیا تھا اسکی تکمیل کے لیے۔

۲۔ جن چیزوں میں اہل کتاب مختلف ہو گئے تھے، یا جن میں بھٹک گئے تھے، یا جنکو بھلا دیا تھا، یا جن میں زیادتی یا تبدیلی کردی تھی، انکی وضاحت کے لیے۔ جیسا کہ کہا ہے ویل للذین یکتبون الکتاب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عند اللہ لیشتروا بہ ثمنا قلیلا (ان لوگوں کے لیے ہلاکی ہے جو کتاب اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے ہے تاکہ اسکے ذریعہ سے کچھ معاوضہ حاصل کرلیں)

یہ اصل مقاصد ہیں۔ باقی اس پر مزید ذکر الٰہی، دعوت اور موعظت کی وہ باتیں ہیں جو کتب مقدسہ کی خصوصیات میں سے ہیں۔

قرآن مجید نے اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے صرف معالی امور اور حقائق حکمت کو پیش نظر رکھا، اور قصص، ظواہر احکام، اور سفاسف تاریخ کی ان تفصیلات سے زیادہ تعرض

نہیں کیا جن سے بالعموم قرآن کے مخاطب واقف تھے۔ کیونکہ واقفیت کے باوجود انکو دہرانا طبائع پر بار اور بالکل بے نتیجہ ہوتا۔ چنانچہ قرآن نے جو قصے بیان کیے ہیں نہایت بلاغت کے ساتھ یا تو بطور تلمیح اور مثال بیان کیے ہیں یا اہل کتاب کی کسی بڑی تدلیس کو واضح کرنے کے لیے بیان کیے ہیں۔ اسی طرح معلوم احکام میں صرف اس حصہ سے تعرض کیا ہے جو تہذیب و تکمیل کا محتاج تھا۔ آنحضرت صلعم پر ایمان لانے والے یا تو اہلِ کتاب میں سے تھے یا ان لوگوں میں سے جو اہل کتاب سے ملے جلے ہوئے تھے اس وجہ سے کتب سابقہ کی باتوں سے واقف تھے اور قرآن مجید کے اس ایجاز سے انکو اصل مسائل کے سمجھنے میں کوئی اشکال نہیں پیش آتا تھا۔ بلکہ سابق صحیفوں اور قرآن مجید میں اصولی تعلیمات کے اتفاق کے باوجود جو فرق عظیم وہ پاتے اس سے انکی نظروں میں قرآن کی عظمت بہت بڑھ جاتی۔ ان لوگوں کے تاثر کو قرآن نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔ واذا سمعوا ما انزل الی الرسول ترٰی اعینھم تفیض من الدمع مما عرفوا من الحق یقولون ربنا اٰمنا فاکتبنا مع الشاھدین (جب وہ سنتے ہیں اس چیز کو جو رسول پر اتری ہے تو انکی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں بسبب اس حق کے جس کو انھوں نے پہچان لیا۔ کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم ایمان لائے۔ پس ہمکو گواہی دینے والوں میں لکھ)

اس تفصیل سے مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوئیں۔

۱۔ پرانے صحیفوں کی تصحیح و تاویل قرآن کی روشنی میں کرنی چاہیے۔ اہل کتاب کے لیے حق معلوم کرنے کی راہ یہی ہے۔

۲۔ قرآن اور کتب سابقہ کے مشترک قصص میں جہاں اختلاف ہوگا وہاں ہم قرآن کی طرف رجوع کرینگے، کیونکہ قرآن محفوظ ہے۔

۳۔ ابتدا سے لیکر اتمام شریعت تک کے تمام مدارج کا جو شخص مطالعہ کریگا اس پر اس ملت

کامل کی فضیلت واضح ہوگی۔

۴۔ متضاد اور مخلوط اسرائیلیات کی حقیقت واضح ہوگی، اور ہم میں سے جو لوگ ان کے سبب سے غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں انکی غلطیوں کی اصلاح ہو جائے گی۔

۵۔ اہل کتاب پر یہ حقیقت واضح ہوگی کہ قرآن انکی کتابوں سے اخذ نہیں کرتا بلکہ ان کی غلطیوں کی اصلاح کرتا اور ان کو اوہام کی وادی سے نکال کر حقیقت کی شاہراہ پر لاتا ہے۔

۶۔ قرآن کی ان بہت سی آیتوں کی صحیح تاویل ہوسکیگی جو درحقیقت توریت کی طرف اشارہ کر رہی ہیں لیکن ہمارے مفسرین انکو قرآن سے متعلق خیال کرتے ہیں۔ مثلاً ما ننسخ من آیۃ او ننسھا الآیہ۔ یا فینسخ اللہ ما یلقی الشیطن الآیہ اس مقدمہ کو تمام کرنے سے پہلے ایک بات کا ذکر ہم ضروری سمجھتے ہیں جو عیسائی عام مسلمانوں کو دھوکا دینے کے لیے پیش کرتے ہیں اور اس کو ہمارے خلاف اپنی سب سے زیادہ مضبوط دلیل سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ از روئے قرآن انجیل پر ایمان لانا مسلمانوں کے لیے ضروری ہے۔ لہذا اگر قرآن کسی امر میں انجیل کی مخالفت کرے تو وہ خود اپنے آپ کو جھٹلائیگا۔ اسکے بعد وہ ہمکو اُن تمام لغویات و مزخرفات پر ایمان لانے کی دعوت دیتے ہیں جو انھوں نے اپنی کتاب میں ملا دی ہیں اور اپنے دعوے پر قرآن مجید کی بعض آیتوں سے دلیل لاتے ہیں مثلاً ..... [1]

مقدمہ (۹)

سورتوں کی مقدار

اوپر لکھ چکا ہوں کہ قرآن مجید کی چھوٹی سورتیں اپنی عظمت، اپنی حکمت اور اپنے نظم کے اعتبار سے بڑی سورتوں کی ہمسری کرتی ہیں۔ اب اس اجمال کی تفصیل کرتا ہوں۔

---

[1] اس مقام پر اصل میں بیاض ہے۔ (مترجم)

ہمارے قدیم علمار نے بھی بعض چھوٹی سورتوں کی نسبت کہا ہے کہ یہ تہائی قرآن کے برابر ہیں یا بعض کی نسبت کہا ہے کہ یہ پوری کرنے والی ہیں۔ مثلاً سفیان بن عینیہ سے روایت ہے کہ سورہ فاتحہ نماز کو پوری کرنے والی ہے کیونکہ یہ علم کو پورا کرنے والی ہے۔ حضرت امام شافعیؒ سے روایت ہے کہ اگر صرف سورۂ عصر نازل ہوتی تو بھی کافی تھی۔ جو لوگ اہل تدبر ہیں وہ کم از کم خاص سورتوں کے بارہ میں تو اس حقیقت کے اعتراف سے انکار نہیں کر سکتے۔ لیکن اگر وہ مزید تدبر کرینگے تو ان کو اس امر میں بھی شبہ نہیں باقی رہیگا کہ جو سورتیں اپنے قامت کے اعتبار سے جتنی ہی چھوٹی ہیں معنی کے اعتبار سے اتنی ہی بڑی ہیں۔ چھوٹے سے حجم کے اندر اسرار حکمت کے اتنے خزائن بند ہیں کہ اگر کھول دیے جائیں تو دفاتر کے اندر نہ سمائیں۔

اس کی حکمت اور اسکی نوعیت مثالوں سے واضح کرنا چاہتا ہوں:۔

(۱) اسکی پہلی حکمت یہ ہے کہ دین کے اصول شدتِ ضرورت کے لحاظ سے اس امر کے مقتضی ہیں کہ ہمیشہ مستحضر رہیں۔ یہ چیز چاہتی ہے کہ ان کو نہایت مختصر کلمات اور جچے تلے الفاظ کے اندر گرہ کیا جائے کہ امثال کی طرح زبانوں پر چڑھ جائیں اور ادا کرنے کے لیے نہایت ہلکے پھلکے لیکن دل کے لیے نہایت گراں ارز اور وزنی ہوں۔ اس طرح کی باتوں کو اگر طویل عبارتوں میں بیان کیا جائے تو اندیشہ ہے کہ اُن کے پھیلاؤ کے اندر گم ہو جائیں۔

(۲) دوسری حکمت یہ ہے کہ تعلیم کی ابتدا میں قلوب بند ہوتے ہیں۔ نہ تفصیلات کلام کے لیے انکے اندر گنجائش ہوتی ہے نہ جزئیات احکام کے لیے۔ اس وجہ سے صرف جوامع الکلم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ صالح بیج جب پھوٹتا ہے تو تفصیلات سے اس کی آبیاری کی جاتی ہے اور اس طرح آہستہ آہستہ دل کی وسعت اور اسکے علم دونوں میں اضافہ ہوتا ہے۔

(۳) اہلِ عرب سجع کی طرح ایجاز کے بھی بڑے دلدادہ تھے اس وجہ سے پہلے اسی اسلوب

کلام میں اُنکو دعوت دی گئی جسکے لیے وہ مستعد تھے تاکہ انکو اپیل کرے۔

(۴) ان کے کاہنوں کا کلام ایجاز اور سجع دو چیزوں کا مجموعہ ہوتا تھا۔ اسکے وہ گرویدہ تھے اور اس کو فصیح کلام کی ایک ضروری خصوصیت خیال کرتے تھے۔ یہ مناسبت مقتضی ہوئی کہ قرآن مجید بھی یہی روش اختیار کرے تاکہ وہ اس سے بیگانگی نہ محسوس کریں۔

باقی رہا چھوٹی سورتوں کا بڑا ہونا تاویل کے پہلو سے تو .... [۱]

مقدمہ (۱۰)

قرآنی تعلیم کے اصولی مسائل

تعلیم قرآنی کے بنیادی مسائل دو حصوں میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں۔ عقائد، اور اعمال۔ اعمال تین قسم کے ہیں شخصی، منزلی، مدنی۔ عقائد کے اساسی مسائل توحید، نبوت، معاد ہیں (اپنے دلائل کے ساتھ)۔ اعمال میں نماز ہے اور اسی میں حج شامل ہے۔ زکوۃ ہے اور اسی کا جزء روزہ ہے۔ مکارم اخلاق ہیں یعنی بِر و معروف جس کا ضد منکر ہے اور شہادت بالحق ہے یہ شخصی اعمال ہیں لیکن ان کا تعلق جماعت سے بھی ہے۔ اسکے بعد قسط اور اسکے بعد تعاون کا درجہ ہے۔

توحید کے ساتھ جبر و قدر اور وحدت الوجود کا تعلق ہے۔ پھر اسکے اور نبوت کے ساتھ شفاعت کا تعلق ہے۔ معاد کے ساتھ جنت و دوزخ کی حقیقت کے مسائل ہیں۔ قسط میں میراث، نکاح اور معاملات داخل ہیں۔ تعاون میں خلافت، سیاست اور جہاد شامل ہیں۔ پھر اعمال کے سرچشمے اخلاق میں بھی ہیں، مثلاً محبت، صبر، عزم، تقوی، اور عدل ہیں۔ ان میں سے بعض چیزیں

[۱] یہاں مولف رحمہ اللہ علیہ نے بیاض چھوڑ دی ہے اور ایک نہایت اہم بحث ناتمام رہ گئی ہے لیکن قرآن کی جو تفسیریں شایع ہوچکی ہیں ان میں سے تفسیر سورہ کوثر جسکا ترجمہ ان صفحات میں بھی شایع ہوچکا ہے، اس ناتمام بحث کو مکمل کر دیتی ہے۔ (مترجم)

باعتبار اصول باہم گتھی ہوئی ہیں۔ میں نے کتاب اللہ سے جو کچھ سمجھا ہے اُسکی روشنی میں بقدر ضرورت بعض مسائل پر گفتگو کرونگا۔

جہاد ۔ قدماء کا خیال یہ تھا کہ آیت سیف نے موعظت کی بہت سی آیتوں کو منسوخ کردیا ہمارے زمانہ کے متکلمین کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ آیت سیف نے منسوخ تو نہیں کیا ہے لیکن اسلام میں جہاد صرف دفاع کے لیے ہے۔ عہدِ نبوت میں جو غزوات ہوئے ان سب کی نوعیت یہی ہے۔ بعد میں خلفاء اور صحابہؓ نے جو لڑائیاں لڑیں وہ تمام ملوکانہ جنگیں تھیں۔ ان کو جہاد فی سبیل اللہ سے کوئی تعلق نہیں۔

میرے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلعم کو اس وعدہ کی تکمیل کے لیے بھیجا تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا تھا اور آپکو اس ذمہ داری کا وارث بنایا تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اس حکم کے بموجب تھی وطھر بیتی للطائفین والعاکفین والرکع السجود (اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع وسجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھو)۔ نیز آپ نبی خاتم کی حیثیت سے مبعوث ہوئے تھے اور آپکے دین کو اللہ تعالیٰ تمام ادیان پر غالب کرنے والا تھا۔ اسکے لیے آپکو حکم ہوا کہ لوگوں کو وعظ وتلقین فرمائیں کہ لوگ آپکی باتوں کو سنیں اور مانیں اور اس وقت تک آپکو قتال کی اجازت نہیں دی گئی جب تک حجت تمام نہ ہو جائے اور تبلیغ اپنی حد کو نہ پہنچ جائے۔ اس وقت آپکو کعبہ کو مشرکین کے ہاتھوں سے چھڑانے اور عہد ابراہیمی کے بموجب دین حنیفی کے احیاء کا حکم ہوا اور ہجرت کے بعد آپکو قتال کی اجازت دی گئی۔ "ہجرت کے بعد" اس لیے کہ ہجرت سے پہلے جہاد، سوائے اسکے جو حفاظت نفس کے لیے ہو، سراسر ظلم وفساد ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قتال، دفاع کے لیے نہیں واجب ہوا بلکہ کعبہ کو فتح کرنے اور بنی اسمٰعیل کے اندر دین حنیفی کے احیاء کے لیے ہوا۔

باقی رہے غیر بنی اسمٰعیل تو ان کے اندر اس لیے کہ انکو عدل و قسط پر قایم کیا جائے اور زمین کو فساد سے پاک کیا جائے۔ اہل کتاب اور غیر بنی اسمٰعیل پر دین کے معاملہ میں کوئی اکراہ نہیں ہے ان کے لیے عدم ایمان کی صورت میں جزیہ کی راہ کھلی ہوئی ہے لیکن بنی اسمٰعیل کے لیے یہ راہ باز نہیں ہے۔ ان کے اوپر ان ہی کے اندر کے ایک شخص کے ذریعہ سے حجت تمام کردی گئی ہے۔ وہ ان کا دل اور انکی زبان تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کوئی باہر کے آدمی نہ تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے وعظ کہنے کے لیے بھیجدیا ہو۔ آپ ان کے نخل فطرت کے ایک پختہ پھل تھے۔ ان کے اندر آپ پیدا ہوئے، ان ہی کی برائیوں اور بھلائیوں کے اندر آپکی نشوونما ہوئی لیکن آپکی فطرت کی پاکیزگی نے انکی تمام خوبیاں اپنے اندر جذب کرلیں اور ساری برائیاں پھینکدیں یہاں تک کہ آپ اس شفاف روغن کے مانند ہوگئے جو آگ کے چھوئے بغیر بھڑک جانے کے لیے آمادہ ہو۔ آپ انکے تمام قویٰ کے مرکز، انکے تمام ترکِ اختیار کے لیے قوت تمیز اور ان کے ارادے کے قلب تھے۔ آپکو ہدایت دے کر گویا اللہ تعالیٰ نے آپکی ذات کے اندر آپکی امت کو اپنے آگے سرفگندہ کردیا۔ کیونکہ آپ قلب تھے۔ جب قلب نے اطاعت کرلی تو گویا تمام اعضا نے سر جھکا دیا۔ اسکی پوری تفصیل بحث نبوت میں ملیگی۔

پھر ظاہر اعتبار سے بھی صورت معاملہ اسی کی مقتضی تھی۔ عرب کی سرداری قریش کو حاصل تھی اور دینی پیشوائی کا منصب عبدالمطلب کو حاصل تھا اور عبدالمطلب سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو منتقل ہوا۔ اسی وجہ سے آپ نے فرمایا۔

انا ابن عبد المطلب		انا النبی لاکذب

نیز آپ ملتِ ابراہیمی اور عہد قدیم کے داعی تھے تو جو اس کا مخالف ہوا وہ باغی اور مفسد ہوا۔

لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ رفع فساد کے لیے جو لوگ آمادۂ جہاد ہوں ان کے لیے سب سے مقدم خود اپنے آپکو شائبۂ فساد سے پاک کرنا ہے۔ جب تک امام اور اسکے متبعین خود قسط پر قایم نہ ہوں اس وقت تک ان کو اس کا حق حاصل نہیں ہے کہ قیام عدل و قسط کا علم لیکر اٹھیں پھر اپنے ملک کے اندر بغیر ہجرت کے جہاد جائز نہیں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سرگذشت اور تمام آیات ہجرت سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ جہاد اگر صاحب جمعیت و اطاعت بادشاہ کی طرف سے نہ ہو تو وہ بغی و عدوان اور فتنہ و فساد ہے۔ پھر قتال کی اجازت حصول قوت کے بعد دی گئی ہے۔ حضرت شعیبؑ کی سرگذشت میں اسکی دلیل موجود ہے۔ انھوں نے فرمایا۔

وان کان طائفۃ منکم آمنوا بالذی ارسلت بہ وطائفۃ لم یؤمنوا فاصبروا حتی یحکم اللہ بیننا۔

اگر ایک جماعت تم میں سے اس چیز پر ایمان لائی ہے جسکو دیکر میں بھیجا گیا ہوں اور دوسری جماعت ایمان نہیں لائی ہے تو صبر کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے درمیان فیصلہ کردے۔

ان تین شرطوں کے ساتھ جہاد قیامت تک کے لیے واجب ہے۔ دین کے معاملہ میں اکراہ اور فساد و بغی جائز نہیں ہے لیکن حق کی شہادت، تبلیغ اور مجادلہ حسنہ ضروری ہے۔

مقدمہ (۱۱)

معروف و منکر

معروف وہ ہے جسکو عرب نے معروف مانا ہو اور منکر وہ ہے جس کو انہوں نے منکر قرار دیا ہو۔ اہل عرب جاہلیت میں ایسے جنگلی نہیں تھے جنکو خیر و شر میں کوئی امتیاز نہ ہو۔ یونانیوں اور ہندوستانیوں کے روشن ترین دور میں ان قوموں کے ادب کا جو حال تھا، اہل عرب کا ادب اخلاقی اعتبار سے ان سے بدرجہا اونچا تھا۔ جن لوگوں نے انکی تاریخ مسخ کی ہے اگر ان کی جہالت

سے قطع نظر کرکے انکے کلام پر نظر ڈالو تو ان کا اخلاقی معیار معلوم ہوگا۔ یہاں تک کہ اس اعتبار سے انکا وہ شاعر بھی تمہاری نظروں میں وقیع معلوم ہوگا جو اپنی شہوت پرستیوں کے لیے مشہور ہوا اور ملک الضلیل کے لقب سے پکارا گیا۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہاں ایک ضمیمہ[1] میں ان کے کلام سے کچھ شواہد پیش کریں۔ تاکہ واضح ہو سکے کہ ان کے ہاں وہی چیزیں معروف تھیں جو مکارم اخلاق میں داخل ہیں اور قرآن نے ان کے سامنے جو چیزیں پیش کیں وہ انکے معروف کی تکمیل کرنیوالی تھیں، اسکو برہم کرنیوالی نہیں تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اندر جو صالح طبیعتیں تھیں انکو قرآن نے اپنی طرف جذب کر لیا۔ صرف ان لوگوں نے مخالفت کی جو شریر تھے یا جنکو اپنی پیشوائی کے چھن جانے کا اندیشہ تھا، ٹھیک اُس طرح جس طرح احبار یہود نے بغی و حسد کی وجہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مخالفت کی۔ امیہ بن ابی صلت وغیرہ کے متعلق کون نہیں جانتا کہ یہ دین حنیفی کے معتقد تھے لیکن محض بربنائے حسد ان لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی۔

پھر یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ نبی کی روح بیدار خود بھی معروف و منکر کی معرفت کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ جن چیزوں کے بارہ میں وحی کی رہنمائی موجود نہیں ہوتی ہے ان کے بارہ میں وہ اپنے الہام سے امت کو نزول وحی تک کے لیے حکم دیتا ہے۔ اور یہ کام اسکے منصب کا ایک قدرتی جزو ہوتا ہے۔ نیز اسکو خدا کی طرف سے امر بالمعروف کا حکم ہوتا ہے اور امت کو حکم ہے کہ وہ معروف میں سے جن باتوں کا حکم دے ان میں اسکی پیروی کرے۔ ان کے علاوہ آپکے زمانہ میں آسمانی شریعتوں کی بہت سی بچی کھچی باتیں باقی تھیں۔ مثلاً دین حنیفی کی تعلیمات میں سے حج، قربانی، نماز کے کچھ بقایا موجود تھے، نیز اہل کتاب کے سنن موجود تھے (سرسید احمد کا یہ خیال غلط ہے کہ عربوں نے تمام مذہبی باتیں یہود سے اخذ کیں اور اسلام نے بھی اکثر احکام یہود ہی سے لیے اور

[1] یہ ضمیمہ مولانا یہاں نہ درج کر سکے لیکن اپنی دوسری تالیفات میں انھوں نے اس سے تعرض کیا ہے (مترجم)

دینِ حنیف کے آثار میں سے صرف توحید، ڈاڑھی اور ختنہ باقی رہ گئے تھے۔)

یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شروع میں جزئیات احکام کا حکم نہیں ہوا بلکہ معروف کا حکم ہوا مثلاً، نماز، ذکر، صدقہ، یتیم پر شفقت اور دوسرے مکارم اخلاق۔ پھر جب کسی چیز کے بارہ میں تفصیل نازل ہوگئی تو اس باب میں اللہ کی تعلیم اصل بن گئی اور معروف کا لحاظ ختم ہوگیا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ کسی بارہ میں معروف کا حکم ہوا۔ پھر اس کے متعلق توضیح نازل ہوئی تو جس حصہ سے متعلق توضیح نازل ہوئی اس میں معروف منسوخ ہوگیا اور جس بارہ میں توضیح نازل نہیں ہوئی اس میں معروف کا حکم باقی رہا۔ مثلاً مرنیوالے کی وصیت والدین کے لیے منسوخ ہوگئی اور جن اقربا کو وارثت میں کوئی حق نہیں ملا ہے ان کے لیے باقی رہ گئی۔

اصل یہ ہے کہ جن جزئیات تک انسان کی عام عقل اور فطری صلاحیت خود بخود پہنچ سکتی تھی انکو اللہ تعالیٰ نے ہمارے اوپر نہیں لادا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو تقویٰ اور نیکی کی جو صلاحیت خود ہمارے اندر موجود ہے وہ مردہ ہوجاتی۔ چنانچہ اس طرح کے معاملات میں اس نے ہماری عقل پر معروف کو چھوڑ دیا جیسا کہ بہت سی آیتوں میں دیکھتے ہو۔ ..... اور یہ معروف کو باقی رکھ کر اور لوگوں کو اسکی دعوت دے کر پیغمبر نے ملک کے قانون اور اسکے اچھے رسوم کی عزت بڑھائی۔ اور انقلاب اور تخریب کی بجائے اصلاح اور تکمیل کی راہ اختیار کی۔ اور سابقہ ادیان کی بالاجمال تصدیق کی اور ان میں جو زیادتیاں شامل ہوگئی تھیں انکو خارج کرکے لوگوں کو انکی قدیم شاہراہ اور اس فطری ہدایت پر پہنچا دیا جو آدمؑ کے وقت سے موجود تھی۔

مقدمہ (۱۲)

نظم کی دلالت

نظم میں ایک خاص دلالت ہوتی ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مانعین زکوٰۃ سے جو

جہاد کیا اسکی دلیل انکو نظم ہی کے اندر سے ملی۔ انکے استدلال کی ترتیب گویا یوں تھی کہ جو لوگ نماز نہیں پڑھتے وہ ہم سے الگ ہو گئے اور ان سے ہم کو قتال کا حکم ہے۔ تو جو لوگ زکوٰۃ نہیں دیتے ان کے لیے بھی یہی حکم ہونا چاہیے کیونکہ نماز کا ذکر ہمیشہ زکوٰۃ کے ساتھ ہوا ہے۔ جب کتاب اللہ میں اس کی جگہ نماز کے بعد ہے تو لازماً یہی جگہ اسکی دین کے اندر ہونی چاہیے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر ہم نظم سے بے پروائی برتیں تو کتاب اللہ کے ایک بڑے حصہ سے محروم ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

اس ذیل میں یہ نکتہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ربوٰ کی حقیقت قرآن میں زکوٰۃ کی حقیقت کے خلاف قرار دی گئی ہے اور سود خواروں سے جنگ کی اجازت دی گئی ہے تو لازماً یہی حکم مانعین زکوٰۃ کا ہوگا۔

مقدمہ (۱۳)

اجزائے نظام

تم اس بات سے ناواقف نہ ہو گے کہ قرآن مجید کی تقسیم رکوع اور تیس پاروں میں بعد کی چیز ہے اور اگر غور کرو گے تو معلوم ہوگا کہ رکوع کا مقصد فصل ہے۔ جن لوگوں نے رکوع ٹھیرائے ہیں انھوں نے مفاصل کلام کا لحاظ کر کے انکی جگہیں متعین کی ہیں۔ انکے سامنے یہ چیز تھی کہ قاری ایسی جگہ قطع کلام نہ کر دے جہاں وصل ہونا چاہیے۔ اس مقصد کے لحاظ سے ان کے اندازے کسی قدر صحیح ہیں۔ لیکن ترتیب کے علم کی ضرورت ہنوز باقی ہے۔ کیونکہ رکوع کی تقسیم صرف فصل کا پتہ دیتی ہے۔ حالانکہ فصل کے ساتھ وصل بھی ہے۔ رکوع کے ساتھ کلام بالکلیہ منقطع نہیں ہو جاتا اور رکوع سورہ کے تمام اجزاء کو ایک درجہ پر کر دیتا ہے۔ بسا اوقات ایک بات دوسری بات کے تحت میں ہوتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ کتابوں کو حصوں، پھر ابواب، پھر فصلوں، پھر فقرات

میں تقسیم کرتے ہیں - رکوع سے صرف فصل ظاہر ہوتا ہے - پس رکوعی تقسیم نے مفید ہونے کے باوجود نظم کے بیان کی ضرورت اور زیادہ بڑھادی- تعیین رکوع سے پہلے کلام بالکل متصل نظر آتا تھا جسکی وجہ سے وہ لوگ جو غور کے عادی تھے وجوہ اتصال کا بھی پتہ لگا لیتے تھے لیکن رکوع ٹھیرا دینے کے بعد قاری کو یہ گمان ہوتا ہے کہ یہاں بات بالکل ختم ہوگئی- اس لیے ایسی تقسیم کی ضرورت ہے جو ربط و انقطاع دونوں کو ظاہر کرے -

تیس پاروں کی تقسیم بالکل مقداری تقسیم ہے- اور بعض اوقات اس سے بھی قطع کلام کا گمان ہوتا ہے - میں اس کے ترک کو پسند کرتا ہوں - منازل کی تقسیم کافی ہے - یہ تقسیم سورتوں کے اجزاء کی قطع و برید بھی نہیں کرتی -

اوپر میں نے یہ جو کہا ہے کہ جن لوگوں نے سورتوں کو رکوع میں تقسیم کیا ہے ان کے اندازے کسی قدر صحیح ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر جگہ صحیح نہیں ہیں- انھوں نے بہت سے مفاصل چھوڑ دیے ہیں- مثلاً سورۃ قمر کو بلا لحاظ اسلوب کلام و مقدار تین رکوع میں تقسیم کر دیا ہے حالانکہ اس کو چھ میں تقسیم کرنا تھا-

۱- اقتربت الساعۃ ۲- کذبت قلبھم قوم نوح ۳- کذبت عاد فکیف کان عذابی ونذر ۴- کذبت ثمود بالنذر ۵- کذبت قوم لوط بالنذر ۶- ولقد جاء ال فرعون النذر-

اس کام میں مدد خود قرآن مجید کے لفظی و معنوی اشارات سے مل سکتی ہے - لفظی اشارات کے لیے دلیل راہ سورتوں کے اوائل کے اسالیب ہیں مثلاً یا ایھا الذین یا ایھا الناس - الم تر - ارأیت - قل وغیرہ اور واضعین رکوع نے اسی سے مدد لی بھی ہے - اسی طرح قافیہ کی تبدیلی آیات کی مقدار، اسلوب کی یکسانی، عبارت کی ہم رنگی بھی

ان کے سامنے رہی ہے۔۔ [۱]

مقدمہ (۱۴)

سورتوں کے نام اور عمود سورہ

سورتوں کے نام میں چار اصول پیش نظر معلوم ہوتے ہیں۔

۱۔ بعض سورتوں کے نام ان کے ابتدائی الفاظ سے رکھدیے گئے ہیں۔ سیوطیؒ کی تفصیل کے مطابق ایسی سورتیں مندرجہ ذیل ہیں۔

الحمد، برأۃ، سبحٰن، طٰہٰ، حوامیم، یٰسین، اقتربت، الرحمٰن، تبارک، سأل، عم، والنازعات، ارأیت، سورہ تبت وغیرہ۔ یہود کے ہاں بھی اسی اصول پر صحیفوں کے نام تھے۔

۲۔ بعض سورتوں کے نام ان کے کسی مخصوص لفظ سے ہیں۔ مثلاً زخرف، شعراء، حدید، ماعون وغیرہ۔ یہ الفاظ سورہ کے مقصد کو نہیں ظاہر کرتے بلکہ سورہ کے اندر بطور ایک نمایاں نشان اور علامت کے ہیں جو اپنے مسمی کو ممتاز کرتے ہیں۔ اہل عرب اس اصول پر اشخاص اور اشیاء کے نام رکھتے تھے۔ متلمس اور تابط شرا وغیرہ ناموں میں یہی اصول ہے۔ اسی طرح منطقی معانی کو کسی غرض خاص سے ممیز کرتے ہیں اسکو حقیقت معنی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

۳۔ بعض سورتوں کے نام ایسے الفاظ سے ہیں جو سورت کے کسی اہم مضمون کا پتہ دیتے ہیں مثلاً سورہ نور کا نام آیت نور کی وجہ سے ہوا۔ آلِ عمران، سورۂ نساء، سورہ ابراہیم سورہ یونس وغیرہ بہت سے اسماء اسی طریق پر ہیں۔

۴۔ بعض سورتوں کے نام ان کے اُس مقصد کے لحاظ سے ہیں جو سورہ میں روح کی طرح ساری ہے، مثلاً سورہ فاتحہ کا نام سورہ صلوٰۃ ہے، اسی طرح سورہ برأت اور سورہ بنی اسرائیل اور سورۂ محمد سورہ قتال کے نام سے موسوم ہوئی۔ سورہ اخلاص اور معوذتین بھی اسی ذیل میں شامل

[۱] یہاں اصل میں بیاض ہے (مترجم)

ہیں - یہ چوتھا اصول تسمیہ میں سورہ کے اصل مقصد و مفہوم کو پیش نظر رکھتا ہے - اگر ہر سورہ کا نام اسی اصول پر ہوتا تو اہلِ نظر کے لیے ہر سورہ کا نظام واضح ہو جاتا - میں اس میں کوئی قباحت نہیں دیکھتا کہ سورتوں کے ایسے نام بھی رکھے جائیں جو ان کے مقصد کا پتہ دیں بشرطیکہ شریعت اس سے مانع نہ ہو - اب میں اسی مسئلہ پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں ..... [1]

مقدمہ (۱۵)

تعیین خطاب

مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ پورا قرآن اللہ کا کلام ہے یعنی اس کو اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا ہے - اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمام خطاب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے مثلاً ایاک نعبد و ایاک نستعین میں ظاہر ہے کہ خطاب بندہ کی طرف سے ہے علماء کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سورہ تعلیم فرمائی ہے گویا یوں فرمایا کہ اس طرح کہو - لیکن یہاں کہو کا لفظ موجود نہیں ہے تو اس مقدر کو کیسے جانا جائے ؟ اسی طرح کا سوال مخاطب کے باب میں بھی پیدا ہوتا ہے - یعنی خطاب کن سے ہے - خطاب میں دو جہتیں ہیں - ایک یہ کہ کس کی طرف سے دوسرا یہ کہ کس کی طرف - اور ان دونوں کا حال یہ ہے کہ کبھی عام ہوتے ہیں اور مراد خاص ہوتی ہے، اسی طرح اس کے برعکس بھی ہوتا ہے - اور چونکہ جہت اختلاف کی بنا پر ہی اور اس کے عموم و خصوص کی وجہ سے معانی میں بڑی تبدیلیاں ہو جاتی ہیں لہذا ضروری ہے کہ اسکے لیے ایسے اصول دریافت کیے جائیں جو مشکلات میں رہنمائی کریں - کیونکہ اس معاملہ میں بعض مرتبہ ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں جو آدمی کو شائبہ شرک کے قریب پہنچا دیتی ہیں - مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ ایک جگہ یہ تک کہہ گذرے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو

[1] یہاں اصل میں بیاض ہے (مترجم)

نبی کا بندہ بنا دیا ہے کیونکہ آنحضرت صلعم کو حکم دیا ہے کہ آپ لوگوں کو یا عبادی الذین اسرفوا الآیہ (اے میرے بندو جنھوں نے زیادتی کی) کے الفاظ سے خطاب کریں۔ مولانا رومؒ کے متعلق میرا یہ گمان نہیں ہے کہ انھوں نے فی الحقیقت نبی کو خدا کا شریک بنانا چاہا ہے۔ لیکن بات انکی زبان سے وہی نکل گئی ہے جو مشرکین کے اقوال سے مشابہت رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ انکی اس لغزش کو معاف فرمائے۔ اس آیت میں خطاب کی نوعیت بالکل واضح ہے۔ یا عبادی الذین اسرفوا الآیہ کا خطاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کی طرف ہے۔ اسکے شروع میں جو قُلْ ہے وہ پیغمبر کو خطاب ہے کہ آپ یہ پیغام حرف بحرف بندوں کو پہنچا دیں۔

کسی عام کلام کی توجیہ اسکی خاص جہت کے اعتبار سے ایک مستقل باب ہے۔ تعیین خطاب کا علم اسی باب کا ایک شعبہ ہے۔ جس شخص پر کلام کا صحیح رخ واضح نہیں ہوگا وہ اس کی صحیح تاویل تک ہرگز نہیں پہنچ سکتا۔ پس یہ باب تاویل اور نظم کلام کے فہم کی کلید ہے اور اس سے بے خبری بہت سی غلطیوں اور ٹھوکروں کا سبب ہو سکتی ہے۔ ایک مستقل مقدمہ[1] میں ہم علم توجیہ کے عام قواعد بھی بیان کرینگے۔ اصول بیان کرنے سے پہلے یہ مقدمہ ہم نے محض اس لیے لکھدیا ہے کہ فی الجملہ اس مسئلہ سے لوگوں کو اُنس ہو جائے۔ مسئلہ خطاب ان بہت سی غلطیوں کی اصلاح کرتا ہے جن میں ہمارے مفسرین مبتلا ہیں۔ پس ضروری ہے کہ ہم اس پر علحدہ بحث کریں۔

خطاب میں جب مختلف پہلوؤں کا امکان ہو تو اسکو لفظ مشترک کی طرح سمجھنا چاہیے اور اس میں بعض پہلوؤں کا اخذ اور بعض کا ترک ناگزیر ہے۔ جس طرح ایک لفظ مشترک کے تمام معانی کو ہم معلوم کرتے ہیں اور پھر سیاق کلام کی روشنی میں کسی معنی کو اخذ کرتے اور بقیہ کو چھوڑتے ہیں وہی طرزِ عمل ہمارا اس وقت ہوگا جب کوئی خطاب محتمل الوجوہ ہو۔ لہذا اولین شے

[1] اس مسئلہ کی پوری توضیح مولاناؒ نے اصول التاویل اور کتاب الاسالیب میں فرمائی ہے۔ یہاں یہ بحث ناتمام رہگئی ہے (مترجم)

اس سلسلہ میں یہ ہے کہ ہم خطاب کے وجوہ معلوم کریں۔

خطاب میں ایک مصدر ہوتا ہے اور ایک منتہیٰ۔ مصدر یا تو اللہ تعالیٰ ہوگا، یا جبریل، یا رسول، یا لوگ۔ اسی طرح منتہیٰ یا اللہ تعالیٰ ہوگا، یا رسول، یا لوگ۔ لوگوں میں، مسلمان ہونگے، یا منافقین یا اہل کتاب، یا ذریت اسمٰعیل، یا ان میں سے دو یا تین یا سب۔ اہل کتاب میں سے یا تو یہود ہونگے یا نصاریٰ یا دونوں۔ یہ پہلو تو ظاہر ہیں۔ اب انکے اختلاط و التباس کی صورتوں پر غور کرنا چاہیے مصدر میں التباس اللہ تعالیٰ، رسول اور جبریل کے مابین ہوتا ہے۔ اگر تم بغیر تنبیہ کے قرآن پڑھتے چلے جاؤ تو یہ امتیاز مشکل ہوگا کہ کون قائل ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت جبریل اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ یہ کبھی مُرسِل کا قول نقل کرتے ہیں، اور کبھی وہ بات ادا کر دیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انکی زبان پر جاری فرمائی ہے۔ پھر حضرت جبریل اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ یہ کبھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محض مبلغ کلام الٰہی کی حیثیت سے کلام کرتے ہیں اور کبھی آپکے معلم کی حیثیت سے، اور انکے معلم ہونے کی حیثیت خود اللہ تعالیٰ نے واضح کر دی ہے۔ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى، ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى۔

پھر یہ تمام حیثیات ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی بغیر کسی تنبیہ کے نمایاں ہوتی ہیں اور سیاق کلام کے سوا کوئی اور چیز اس باب میں رہنمائی کرنے والی نہیں ہوتی۔ اور یہ بات کچھ قرآن مجید ہی کے ساتھ مخصوص نہیں۔ یہ چیز معاملہ رسالت کی خصوصیات میں سے ہے۔ زبور میں بھی اسکی مثال موجود ہے۔ دیکھو ۴۶ آیات ۷۔ ۱۱ "لشکروں کا خداوند ہمارے ساتھ ہے۔۔۔۔۔ خاموش ہو جاؤ اور جان لو کہ میں خدا ہوں۔۔۔۔۔۔۔ لشکروں کا خداوند ہمارے ساتھ ہے"۔ قاعدہ کلیہ اس باب میں یہ ہے کہ جب کلام صریحاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگا تو اس میں جلال و ہیبت اور قوت و سطوت کا اظہار ہوگا۔ لہٰذا اس طرح کا کلام ضرورت کے مواقع پر نمودار ہوتا ہے۔ ہم یہاں بعض مثالیں

پیش کرتے ہیں تاکہ ہمارا مدعا سمجھنے میں تم کو آسانی ہو۔

مثلاً سورہ اقراء شروع سے حضرت جبریل کی زبان سے ہے۔ لیکن جب غصہ کے اظہار کا موقع آیا ہے کلام صراحت کے ساتھ خدا کی طرف سے ہوگیا ہے۔ كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ..... (یہ کچھ نہیں، اگر باز نہ آیا ہم چوٹی پکڑ کر گھسیٹینگے)۔

منتہی میں التباس نبی اور مومنین کے مابین ہوتا ہے۔ بعض مرتبہ بظاہر مخاطب پیغمبر ہوتا ہے حالانکہ اصلی روئے سخن امت کی طرف ہوتا ہے۔ پیغمبر چونکہ امت کے وکیل ہونے کی حیثیت سے انکی زبان اور ان کا کان ہوتا ہے اس لیے اسکو مخاطب کیا جاتا ہے۔ تورات میں اسکی بہت مثالیں ہیں کہ مخاطب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بصیغۂ واحد کیا گیا ہے اور مراد انکی امت ہے۔ قرآن مجید میں، اس طرح کے مواقع میں نظم وسیاق کی رہنمائی سے معلوم ہوتا ہے کہ مخاطب کون ہے۔ سورۂ توبہ میں ایک آیت ہے اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَا اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ (اگر تم کو بھلائی پہنچتی ہے تو انکو تکلیف ہوتی ہے اور اگر کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں خوب ہوا ہم نے اپنا بچاؤ پہلے کر لیا)۔ یہاں خطاب واحد کا ہے لیکن مراد اس سے عام مومنین ہیں۔ چنانچہ اسکے جواب سے اسکی وضاحت ہوگئی ہے۔ قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلٰىنَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (کہدو نہیں پہنچیگی ہم کو کوئی مصیبت مگر جو اللہ نے ہمارے لیے لکھدی ہے وہ ہمارا مولا ہے اور چاہیے کہ اللہ ہی پر بھروسہ کریں اہل ایمان) اسی طرح سورہ بنی اسرائیل میں مخاطب پیغمبر صلعم کو کیا ہے اور خطاب امت کی طرف ہے۔ مثلاً اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا (اگر تمہارے سامنے ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچیں تو نہ انکو اُف کہنا اور نہ جھڑکنا اور اُن سے ادب کی بات کہنا) اس طرح کی متعدد مثالیں عام خطاب کی ہیں۔ سورہ بقرہ میں ہے اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ

مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ۔

اسی قاعدہ پر ہم آیت ذیل کو بھی محمول کرتے ہیں..... (بیاض)

مقدمہ (۱۶)

کیفیت نزول

یہ بات خود قرآن مجید سے معلوم ہے کہ قرآن بیک دفعہ نہیں نازل ہوا ہے۔ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا۔

اسی طریق پر قرآن موقع کے لحاظ سے نازل ہوتا تھا۔ پھر جب کسی حکم کی تخفیف یا تکمیل نازل ہوتی تو یا تو اسکو سابق حکم کے ساتھ رکھا جاتا یا سب کے آخر میں تتمہ کے طور پر۔ اور ابواب کے درمیان فصل صرف رکوع کے ذریعہ سے کیا گیا ہے اس وجہ سے ان تتموں کی مناسبت معلوم کرنے میں مشکل پیش آتی ہے۔ سورۂ قیامہ میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلعم سے وعدہ کیا تھا کہ جو باتیں محتاج توضیح ہونگی ان کی خدا کی طرف سے وضاحت کی جائے گی۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ۔ اس وعدہ کے مطابق جب اللہ تعالیٰ نے کسی بات کی وضاحت فرمائی تو اس پر متنبہ بھی فرما دیا۔

علاوہ ازیں اس قسم کے تتمے جہاں جہاں ہیں انکا اسلوب ماقبل کے اسلوب سے عموماً مختلف ہے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ تتمہ ہے۔

بعض مقامات میں انکی نوعیت ایسی ہے کہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی سوال مقدر کا جواب دیا گیا ہے، یا کسی امر غامض پر تنبیہ کی گئی۔

ان امور کے علاوہ یہ بات بھی ملحوظ رکھنی چاہیے کہ بعض سورتیں آنحضرت صلعم کی زبان سے

ادا ہوئی ہیں، بعض حضرت جبریل کی اور اکثر براہِ راست لسان الٰہی سے - یہی انداز قدیم صحیفوں میں بھی ہے - قرآن مجید میں اسکی پوری وضاحت بھی فرمادی گئی ہے -

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ

کسی بشر کی یہ شان نہیں ہے کہ اللہ اس سے کلام کرے، مگر وحی کے ذریعے یا پردہ کی آڑ سے یا بھیجے کوئی رسول (روح القدس) پس وہ (یعنی رسول قدسی) وحی کرے، اس کے (اللہ کے) اذن سے جو وہ چاہے -

دوسری جگہ ہے -

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ

کہدو جو جبریل کا دشمن ہے تو اس نے اسکو (قرآن کو) اتارا ہے تمہارے دل پر اللہ کے حکم سے -

ایک اور مقام میں فرمایا ہے -

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ

یہ ایک رسول گرامی کا قول ہے، جو زور والا، صاحبِ عرش کے یہاں درجے پائے ہوئے، مانا ہوا اور وہاں معتبر ہے - اور تمہارا رفیق مجنون نہیں اور اس نے اُسے دیکھا آسمان کے صاف کنارے میں اور وہ غیب کا حریص نہیں اور یہ شیطان رجیم کی بات نہیں -

نیز فرمایا -

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ

یہ ایک رسول گرامی کا قول ہے - یہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے، تم بہت کم ایمان لاتے ہو - اور نہ کسی کاہن کا کلام ہے تم بہت کم سوچتے ہو - اتارا ہوا ہے عالم کے پروردگار

تَنْزِيلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعَالَمِيْنَ - کی طرف سے -

اس پر پوری بحث ہم نے اپنی کتاب اسالیب القرآن میں کی ہے -

مذکورۂ بالا تفصیل سے تم کو معلوم ہوا کہ قرآن میں بہت سی آیتیں تتمہ اور بیان کے طور پر ہیں، بہت سی آیتیں حضرت جبریل کی زبان سے ہیں، بہت سی آیتیں آنحضرت صلعم کی زبان سے ہیں، بہت سا کلام بلاواسطہ خدا کی زبان سے ہے - تو لازماً آیات کا نظام سمجھنے کے لیے تم کو ان تمام اقسام میں امتیاز کرنا پڑے گا - اسکے بغیر نظام کے سمجھنے میں تمہیں دشواریاں پیش آئینگی - اسکو عام مثال سے یوں سمجھ سکتے ہو کہ ایک تمثیلی قصہ میں مختلف اشخاص اپنی اپنی حیثیت سے مختلف باتیں کہتے ہیں - اگر کوئی شخص یہ گمان کرلے کہ یہ سب ایک ہی شخص کی زبان سے ہے تو اس کو کلام کا ربط سمجھنے میں کیسی زحمت پیش آئے گی - یہ بات ہم نے بطور مثال صورت حال سمجھانے کے لیے کہی ہے ورنہ کلام الٰہی ان مثالوں سے بہت ارفع ہے -

---